عاشر وکیل راؤ ــــ
شخصیت اور فن ــــ
عبداللہ نعیم رسول

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیم

سلسلہ اشاعت: 122
تاریخ اشاعت: اگست 2023
قیمت: =/600 روپے

اشاعت/حقوق: عبداللہ نعیم رسول
کمپوزنگ: ''ماہوزا''، کمپیوٹر کمپوزنگ، فیصل آباد
تزئین: علی حسن زیدی
نظرِ ثانی: ڈاکٹر شاکر کنڈان
سرِورق: زیدی
بائنڈنگ: محمد رضوان اصغر 0300-8677908
ناشر: عقیدت پبلی کیشنز، سرگودھا
رابطہ: 0304-3839675
مطبع: زیدیؔ، ڈیجیٹل پرنٹنگ، فیصل آباد 0300-6619124
اہتمام: ماہوزا اہلِ قلم کا اشاعتی ادارہ

☆

اِنتساب
پیاری بھانجی
ارمین فاطمہ
کے نام

تارو پود

پیش لفظ

سرگودھا پاکستان کا ایک اہم شہر ہے۔اس کے معتبر حوالوں میں ''ادب''، ''شاہین'' اور ''مالٹے'' شامل ہیں۔ دبستانِ سرگودھا جس کے سرخیل نامور نقاد، شاعر اور محقق ڈاکٹر وزیر آغا ہیں۔ جبکہ پاکستان ائیر فورس کے کارناموں کی مناسبت سے یہ شاہینوں کا شہر بھی کہلاتا ہے، اسی طرح ''سٹرس'' اور ''کِنّوں'' کی پیداوار کے حوالے سے یہ علاقہ پوری دنیا میں مقبول ہے۔ ۲۰۰۲ء میں یہاں یونیورسٹی آف سرگودھا قائم ہوئی جو اپنے تحقیقی اور عملی معیار کی بدولت اپنی الگ پہچان رکھتی ہے۔

یونیورسٹی آف سرگودھا کا شعبہ اردو طلباء و طالبات کی تعداد اور اپنی تعلیمی و تحقیقی کاوشوں کی بدولت پاکستانی جامعات میں ایک جانا پہچانا شعبہ ہے، یونیورسٹی آف سرگودھا کے شعبہ اردو میں پی ایچ ڈی، ایم فل، ایم اے اور بی ایس (اردو) کے پروگرام جاری ہیں جن میں اعلیٰ معیار کے تحقیقی و تنقیدی مقالہ جات لکھے جا رہے ہیں، یوں تو یونیورسٹی آف سرگودھا کے تحقیقی مقالہ جات کے موضوعات میں خاصا تنوّع پایا جاتا ہے تاہم یہاں ادبی شخصیات کے حوالے سے بہت عمدہ تحقیقی و تنقیدی کام ہوا ہے۔۔۔سرگودھا کے علمی و ادبی حلقوں میں عاشر وکیل راؤ ایک معروف نام ہے۔ اب تک اُن کی شاعری کے بہت سے مجموعے شائع ہو کر بھرپور پزیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ عاشر وکیل راؤ نے گورنمنٹ کالج سرگودھا سے ایم اے اردو کیا، بعد ازاں انہوں نے یونیورسٹی آف سرگودھا کے ایم فل (اردو) کے ابتدائی سیشن ۱۰۔۲۰۰۸ء میں ایم فل (اردو) کی ڈگری حاصل کی۔ یونیورسٹی آف سرگودھا کا یہ سیشن اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں ڈاکٹر

مقبول نثار ملک، ڈاکٹر ارشد ملک، ڈاکٹر شاکر کنڈان، ڈاکٹر عابد خورشید، ڈاکٹر نسیم عباس احمر، ڈاکٹر خرم ٹوانہ، ڈاکٹر آصف علی، عاشر وکیل راؤ، ڈاکٹر آمنہ جعفری اور راقم السطور شفیق آصف ہم جماعت رہے ہیں۔سرگودھا یونیورسٹی کے مذکورہ بالا سیشن کے تمام اسکالرز مختلف اداروں میں اہم ذمہ داریاں انجام دے رہے ہیں۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سیشن کے زیادہ تر اسکالرز ادیب اور شاعر بھی ہیں، عاشر وکیل راؤ فطری شاعر ہیں یہی وجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں سماجی شعور اور انسانی جذبوں کی فراوانی نظر آتی ہے۔عاشر وکیل راؤ نے مجلسی زندگی میں مثبت کردار ادا کیا ہے، وہ جن دنوں ہوٹلنگ کے بزنس سے منسلک تھے ''الحیات ہوٹل سرگودھا'' ادیبوں اور شاعروں کا مرکز تھا اور وہاں ریگولر آنے والوں میں استادِ محترم ڈاکٹر عامر سہیل، ڈاکٹر ارشد ملک، ڈاکٹر شاکر کنڈان، سید مرتضیٰ حسن، ذوالفقار احسن، ڈاکٹر طارق کلیم، سعید ہاشمی اور نوید ہاشمی شامل تھے، پاکستان کے ادبی حلقوں میں ڈاکٹر شاکر کنڈان ایک معتبر ترین نام ہے، انہوں نے ادب کی مختلف اصناف میں بہت معیاری کام کیا ہے، وہ عاشر وکیل راؤ کے ساتھ مل کر ''عقیدت'' اور ''وصال'' جیسے ادبی رسائل بھی شائع کرتے رہے ہیں علاوہ ازیں شاکر کنڈان اور عاشر وکیل راؤ نے سرگودھا میں بہت سے علمی و ادبی پروگراموں کا انعقاد بھی کیا ہے، اس اعتبار سے انہیں ہم سرگودھا کی ایک اہم ''ادبی جوڑی'' بھی قرار دے سکتے ہیں۔حال ہی میں ڈاکٹر شاکر کنڈان کے صاحبزادے نعیم رسول نے ''عاشر وکیل راؤ کی شاعری کا فکری و فنی جائزہ'' کے عنوان سے بی ایس اردو کا مقالہ تحریر کیا ہے، اس مقالہ کے نگران ڈاکٹر غلام عباس گوندل ہیں جو تحقیق و تنقید کے حوالے سے ایک معتبر نام ہیں علاوہ ازیں ڈاکٹر صاحب تدریسِ اردو کے ایک اچھے استاد کے طور پر اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔

نعیم رسول نے عاشر وکیل راؤ کی شاعری کے فکری و فنی جائزے پر مشتمل مقالہ برائے بی۔ایس (اردو) سیشن: ۲۰۱۸ء۔۲۰۱۴ء میں شعبہ اردو اینڈ اورئنٹل لینگوئجز یونیورسٹی آف سرگودھا سے مکمل کیا ہے، نعیم رسول کو علمی و ادبی ذوق اپنے والد گرامی قدر ممتاز دانشور، محقق، نقاد

اور شاعر پروفیسر ڈاکٹر شاکر کنڈان سے ورثے میں ملا ہے، نعیم رسول ایک جواں فکر شاعر بھی ہیں اور ایک ذہین طالب علم بھی، علاوہ ازیں وہ یونیورسٹی آف سرگودھا کی جانب سے ملکی سطح پر انعامات واعزازات بھی حاصل کر چکے ہیں، انھوں نے پاکستان ٹیلی وژن اور دیگر ٹی وی چینلز کے مختلف پروگراموں میں انعامات بھی حاصل کیے ہیں۔ نعیم رسول یونیورسٹی کی ہم نصابی سرگرمیوں میں فعال ترین رہے ہیں، آج کل وہ ایم فل (اردو) کرنے کے علاوہ سرگودھا کی معروف درسگاہ خالقیہ پبلک سکول اینڈ کالج میں اردو زبان وادب کے لیکچرار کے طور پر اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ نعیم رسول اپنے والدِ محترم پروفیسر ڈاکٹر شاکر کنڈان کی پیروی کرتے ہوئے تالیف و تدوین میں مگن ہیں۔ اس سے قبل وہ شاکر کنڈان صاحب کے مختلف رسائل وجرائد میں بکھرے ہوئے مقالات کو کتابی صورت میں شائع کر چکے ہیں۔ ان مقالات کی اشاعت میں انھوں نے تمام تدوینی اور تحقیقی اصولوں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

عبداللہ نعیم رسول نے اب اپنے بی۔ایس (اردو) کے مقالہ ''عاشر وکیل راؤ کی شاعری کا فکری وفنی جائزہ'' کو جو خوبصورت پیکر عطا کیا ہے وہ ان کی فکری وفنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے، اپنے اس تحقیقی کام کا انتساب انھوں نے اپنے والدین کی پُرخلوص دعاؤں کے نام کیا ہے جنھوں نے ہمیشہ انھیں آگے بڑھنے کا موقع دیا ہے۔ نعیم رسول نے انتساب میں محمد علی ساحلؔ کا یہ شعر شامل کر کے ایک سعادت منداور اطاعت شعار بیٹا ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

دور رہتی ہیں سدا ان سے بلائیں ساحلؔ
اپنے ماں باپ کی جو روز دعا لیتے ہیں

اس موقع پر مجھے اپنا ایک شعر یاد آ گیا ہے

ملی ہے مجھ کو یہ توقیر ماں کے قدموں سے
رہا ہوں ماں کی دعاؤں سے با وقار اب تک

اسی طرح حضرت میاں محمد بخش نے فرمایا تھا

باپ سِراں سے تاج محمد ماواں ٹھنڈیاں چھاواں

البتہ مذکورہ بالا اشعار نعیم رسول کے دل کی آواز ہیں۔۔۔عاشر وکیل راؤ پاکستانی اردو غزل کے ایک نمائندہ شاعر ہیں انھوں نے غزل میں بہت سے فکری اور اسلوبیاتی تجربات بھی کیے ہیں لہٰذا عبداللہ نعیم رسول کا یہ کہنا بہت برمحل ہے کہ:

''شاعری سے مجھے بے تحاشہ لگاؤ ہے۔اچھا شعر سننا اسے یاد کرنا میری عادت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بی۔ایس کے مقالے کے موضوع کے انتخاب کے وقت میں نے شاعری پر تحقیقی کام کرنے کا فیصلہ کیا۔عاشر کی رومانی شاعری بالخصوص مکالماتی شاعری کے تجربے اور اس کی تاثیر بھی اس انتخاب کا سبب بنی۔''

اس میں شک نہیں کہ عاشر وکیل راؤ نوجوان شاعروں میں اپنے منفرد اور الگ اسلوب کی بدولت بے حد مقبول ہیں اور نعیم رسول نے اپنے اس تحقیقی وتنقیدی مقالے میں عاشر وکیل راؤ کی شاعری کے تمام پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھا ہے،اس مقالے کا اہم ترین وصف یہ ہے کہ اس میں ہم عاشر وکیل راؤ کی زندگی اور فن کے تمام گوشوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں،عبداللہ نعیم رسول نے پہلے باب میں عاشر وکیل راؤ کی شخصیت اور سوانح حیات کا جائزہ لیتے وقت ان کی پیدائش،تعلیم، ازدواجی زندگی،کاروبار اور علمی وادبی سرگرمیوں کا بھرپور احاطہ کیا ہے۔

اس مقالے کا باب دوم عاشر وکیل راؤ کی غزل کے فکری جائزہ پر مبنی ہے،اس باب میں جواں سال محقق اور نقاد نعیم رسول نے شاعر کی فکری جہات کا بھرپور احاطہ کیا ہے،اس میں شک نہیں کہ عاشر وکیل راؤ نے اپنی غزل کو فکری اور موضوعاتی سطح پر جو وسعت عطا کی ہے وہ ان کی انفرادی شناخت کا اہم حوالہ ہے، عاشر وکیل راؤ ہر چند ایک رومانوی شاعر ہے تاہم وہ عکسِ حالات کو اس انداز سے شعری پیکر عطا کرتے ہیں کہ وہ ایک تخلیقی عکاس محسوس ہوتے ہیں،ان کی غزل میں زندگی کی تمام تصویریں جھلملاتی ہوئی نظر آتی ہیں،اس ضمن میں ان کے چند اشعار

ملاحظہ کیجیے:

میں اپنے آپ کو ہی ڈھونڈتا ہوں اس طرح جیسے
کوئی بچہ کہیں رکھ کر کھلونا بھول جاتا ہے

ایک مفلس باپ نے بیٹی کی شادی کے لیے
چند نوٹوں کے لیے غیرت کو گروی رکھ دیا

اس نظامِ نو سے آخر کس طرح باغی نہ ہوں
در بدر پھرتے ہیں وہ جو ڈگریوں کے بعد بھی

وہ جس کو ہلانے سے انصاف ملے عاشرؔ
اب ایسی کہیں پر بھی زنجیر نہیں ملتی

شاعر وکیل راؤ بالغ نظر اور صاحبِ بصیرت انسان ہیں، ان کی غزل کے فکری رنگوں میں سیاسی اور سماجی صورتحال کا عکس بہت نمایاں ہے وہ معاشرے میں موجود دورُخی پر یوں تنقید کرتے ہیں۔

عاشر لُوٹنے والوں میں تو
ایک بھی نہ تھا دشمن چہرہ

امیرِ شہر کی نظروں میں سب ہی اچھا ہے
مگر یہ لٹتی رِدائیں کچھ اور کہتی ہیں

کوئی ڈھونڈے تو کیسے کسی کو یہاں
آج کل کون ملتا ہے اپنی جگہ

کیا ہماری قوم کا احساس پتھر ہو گیا
کیوں نہیں اب چونکتی یہ سانحوں کے بعد بھی

عاشر وکیل راؤ کے مذکورہ بالا اشعار اس بات کا اعلامیہ ہیں کہ وہ وطنِ عزیز میں ہونے والی معاشرتی اور سماجی چیرہ دستیوں سے نہ صرف مکمل طور پر آگاہ ہیں بلکہ وہ اپنے اس سماجی شعور میں دوسروں کو شامل کرنے کے خواب دیکھ رہا ہے جو امن اور انصاف پر مبنی ہوتا ہم جب انھیں اپنے ان حسین خوابوں کی اُلٹ تعبیریں ملتی ہیں تو ان کے لہجے میں تلخی در آتی ہے۔

اس طرح کے لوگ بھی دنیا میں دیکھے ہیں کئی
اس طرح جیتے ہیں وہ جیسے خدا ہوتا نہیں

اپنی خواہش کا جیم کتنا مہنگا بھر لیا
ہم نے تو اسلاف کی جنت کو گروی رکھ دیا

اس تمام تر تلخ صورتحال کے باوجود عاشر وکیل راؤ مایوس نہیں ہے، کیوں کہ ان کا وجدان اور احساسِ جواں زندہ ہے۔

اگرچہ زندگی بھر امتحاں میں، میں رہا لیکن
مرا احساس زندہ ہے، مرا وجدان باقی ہے

عاشر وکیل راؤ کی غزل کے فکری جہان کو ان کا رومان پرور لہجہ ملائمت اور تازگی عطا کرتے ہیں، وہ محبت کا شاعر ہے، تاہم ان کی محبت لامحدود جہات کی حامل ہے، وہ کائنات کے

تمام مظاہر سے اپنا جمالیاتی رشتہ مضبوط کرتے دکھائی دیتا ہے۔۔۔نعیم رسول اس حوالے سے رقم طراز ہیں ’’ان کے ہاں محبت زندگی کی ایک اہم قدر ہے، اس کی اہمیت ہر شے سے زیادہ ہے، اسی سے دنیا میں رونق ہے۔زندگی کی تمام رعنائیاں اسی محبت کی بدولت ہے۔‘‘

کس قدر انوکھا ہے ضابطہ محبت کا
کب نجانے ہو جائے معجزہ محبت کا

اک کربِ مسلسل میں رہ کر، ہر ظلم محبت میں سہہ کر
کچھ اور نکھرتے رہتے ہیں، ہم پھر بھی ہنستے رہتے ہیں

زندہ رہنے کو جیسے ہوا شرط ہے
اس محبت میں ایسے وفا شرط ہے

عاشر وکیل راؤ نے عدیم ہاشمی کی تقلید میں بہت سی مکالماتی غزلیں بھی کہی ہیں، وہ مکالماتی غزل کے مزاج دان ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی مکالماتی غزل محبوب سے کلام بھی کرتی ہے اور خود سے ہمکلامی کا منظر بھی پیش کرتی ہے۔

کہا اس نے تمہارے اس جنوں سے خوف آتا ہے
کہا میں نے نہیں ڈرتے محبت کے دوانے سے

کہا اس نے کسی دل پر محبت مہرباں ہو تو
کہا میں نے کہ صرصر بھی صبا محسوس ہوتی ہے

نعیم رسول کے خیال میں ’’عاشر محبت کو تکمیلِ ذات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ گویا کاملیت کی منزل کی سیڑھی محبت ہے۔ایک عاشق اپنے محبوب کو ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہے، محبوب کی خوشی محب

کی خوشی ہے۔محبت جب شدید ہوجائے تو یہ عشق کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔‘‘

عاشر وکیل راؤ کا تصورِ محبت ملاحظہ کیجیے:

جو تم نے آزمانے کو جدائی شرط رکھی ہے
کہیں ایسا نہ ہو میرا جنوں تکمیل کر ڈالے

کہا اس نے محبت کی وکالت کس لیے عاشر
کہا میں نے محبت ہی ہمیں انساں بناتی ہے

تمہیں دیکھا، تمہیں سوچا، تمہیں چاہا، تمہیں مانا
تمہارے عشق میں کھو کر ہوئے یوں پارسا ہیں ہم

عاشر وکیل راؤ فنی طور پر ایک توانا شاعر ہے، وہ شاعری کے اسرار و رموز سے بخوبی واقف ہے، انھوں نے متنوع بحور میں خوبصورت غزلیں کہی ہیں۔ ہر چند عاشر وکیل راؤ ایک فطری شاعر ہے، ان کی تمام غزلیں تخلیقی وفور کی آئینہ دار ہیں تاہم وہ اپنے تخلیقی وجدان اور ریاضت کے بل بوتے پر سخن کے ایسے ایسے پھول کھلاتے ہیں کہ قاری عش عش کر اٹھتا ہے۔ان کی غزلی جہاں فکری اعتبار سے بلند مقام رکھتی ہے وہاں وہ غزل کے تمام فنی تقاضوں کو بھی احسن طریقے سے نبھاتے ہیں، وہ اردو غزل کی روایت اور ارتقا سے واقف ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ غزل کو نئی لفظیات اور مختلف صنعتوں کے استعمال سے پُرتاثیر بنانے کی کوشش بھی کرتے ہیں، وہ اپنے نقاد خود ہیں، اپنی شاعری کا فنی طور پر خود محاکمہ کرتے ہیں شاید اسی وجہ سے ان کے بہت سے اشعار تابدار موتیوں کی طرح جھلملا رہے ہیں۔

عاشر غزل کی طرح نظم کے بھی ایک عمدہ شاعر ہیں لہٰذا وہ غالب کے مقلد بھی ہیں:

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں لیے کے

مرزا غالب نے جس وسعتِ بیانی کا ذکر اپنے مذکورہ بالا اشعار میں کیا ہے عاشر وکیل راؤ نے اس کا بہترین جواز اپنی نظمیہ شاعری کے ذریعے پیش کیا۔ عاشر وکیل راؤ کی نظمیں ان کی غزلوں کی طرح رومان پرور اور جہان پرور ہیں وہ محبت معروضی حالات کو ایک ساتھ اپنی نظموں کے قالب میں ڈھالتے ہیں، نعیم رسول رقم طراز ہیں ''محبت عاشر کو شعر کہنے پر ابھارتی ہے، عاشر کی محبت خالص ہے، اس کے نزدیک محبت بڑے بڑے مسائل کا حل ہے۔ 'اعجازِ لمس'، ' کیسے بھول سکتا ہے'، 'چلو اب مان جاؤ تم'، 'ترا ملنا ضروری ہے'، 'چلو اقرار کرتے ہیں'، 'محبت پھر محبت ہے'، 'سپنوں کی کہکشاں'، 'تم ہو، نا'، 'نظموں کا موضوع محبت ہے۔

عاشر وکیل راؤ کی غزلیہ شاعری کی نسبت ان کی نظمیہ شاعری میں رومانوی عناصر بدرجہ اُتم موجود ہیں، اُن کی زیادہ تر نظمیں محبت کی لطیف کیفیات کی حامل ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ عبداللہ نعیم رسول نے بھی رومانوی احساسات کی ترجمانی قرار دیا ہے۔ عاشر وکیل راؤ کی رومان انگیز نظموں میں اس کی رومانوی غزلوں جیسا رچاؤ ہے، اس ضمن میں ان کی یہ نظم دیکھیے:

تم تو کہتے تھے
کہ میری اہمیت تمہاری زندگی میں
اتنی ہی ہے جتنی کہ
ہوا، پانی، اور روشنی کی
تو کہو
ہماری جدائی کو تو اک عرصہ ہوا
تم اب تلک زندہ کیسے ہو؟

(سوال)

عاشر وکیل راؤ کی نظمی شاعری میں ہر طرح کے شعری تجربات اور ہیئتیں موجود ہیں جو ان کی وسعتِ بیانی کا پتہ دیتی ہیں، وہ اپنی نظموں میں فکر و خیال کا ایسا جہان آباد کرتے ہیں جو ان کے قارئین کو اپنی فکری سلطنت محسوس ہوتا ہے۔اس ضمن میں ان کی نظم ''کچھ سپنے'' ملاحظہ کیجیے

کچھ سپنے تو
بنا پروں کے پنچھی جیسے ہوتے ہیں
لاکھ اڑاؤ آنکھ سے ان کو
پھر واپس آجاتے ہیں

(کچھ سپنے۔۔۔)

اسی طرح عاشر وکیل راؤ وصال کی مختلف اشکال کو اپنے اظہار کے پیکر میں یوں ڈھالتے ہیں

یہ خواہش لاشعوری ہے
سفر میں زندگانی کے
ترا ملنا ضروری ہے

(ترا ملنا ضروری ہے)

عاشر کی غزلیہ اور نظمیہ شاعری کا فکری اور فنی جائزہ ان کی شعری کائنات تک رسائی کا ایک ایسا راستہ ہے جو عاشر کے قارئین کے لیے سنگِ میل بھی ثابت ہوگا۔ میں عاشر وکیل راؤ اور نعیم رسول کے لیے دعا گو ہوں کہ وہ ادب کی وادی میں اسی طرح محوِ سفر رہیں۔

ڈاکٹر شفیق آصف

ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز،
یونیورسٹی آف میانوالی

باب اول

عاشر وکیل راؤ۔سوانح وشخصیت

عاشر وکیل راؤ کا خاندانی پس منظر:

راؤ کا لاحقہ پورے خاندانی پس منظر کی عکاسی کرتا ہے۔راؤ کی اصل راجپوت ہے اور یہ لفظ بذاتِ خود مرکب ہے راج اور پوت کا۔راج کے معنی عموماً سردار اور امیر تو لیے جاتے ہیں لیکن اس کے ایک معنی چمکنے والی شے بھی ہیں جب کہ پوت، بیٹا کو کہتے ہیں۔سنسکرت کے یہ دونوں الفاظ آپس میں مل کر ''شاہی نسل یا ہندوؤں کی بنیادی ذات''(۱) کے معنی دیتا ہے۔راجپوت کا لقب ہند میں سب سے پہلے عوام نے آریائی کھشتریوں کو دیا۔کیپٹن اے ایچ بنگلے کھشتریوں کے بارے لکھتے ہیں:

> "The Kshatriya,i,e,Rajput or governing or military caste,composed of the Maharajas and their warrior kinsmen and companoons, whose duty it was to rule, fight, administer justice and protect the community in general."(۲)

ملک غلام اکبر نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

> ''کھشتریوں کا پیشہ فوجی تھا اور اپنی علاقائی سرحدوں کی حفاظت کے علاوہ دوسری قوموں پر حملہ کرنا،لوٹ مار کرنا اور حکمرانی کرنا اُن کے فرائض میں شامل تھا۔''۳

راجپوتوں کی تاریخ کا آغاز اگرچہ آریاؤں کے کھتری (کھشتری) فرقہ سے ہوا۔لیکن

کھشتری راجاؤں کا پہلا تذکرہ کوروؤں اور پانڈوؤں کے حالات کے ذیل میں ملتا ہے۔''راجہ بھرت پہلا کھتری تھا جس کی اولاد کوروؤں اور پانڈوؤں میں تقسیم ہوگئی۔۔۔اور راجہ منیر رائے راجپوتوں کے سلسلے کا آخری راجہ تھا جس نے ایرانیوں کے ہاتھوں شکست کھائی اور حکومت راجہ سورج کے حوالے کردی۔''(۴) تب تک راجپوت تین گروہوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ایک گروہ سورج بنسی، دوسرا چندربنسی اور تیسرا گروہ یادوبنسی۔''راجہ سورج بنسی کے ۳۵ بیٹے تھے جن سے ۳۴ یا ۳۶ شاخیں نکلیں انہیں میں سے ایک شاخ چوہان تھی۔''(۵) چوہان راجاؤں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ رائے کہلواتے تھے اور شہاب الدین غوری سے پتھورا رائے چوہان کی شکست کے بعد بچے کھچے لوگ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے جن میں سے اکثریت نے اسلام قبول کیا۔ان لوگوں کے دو بڑے مرکز قرار پائے۔ایک اتر پردیش اور دوسرا ہریانہ۔

> ''ہریانہ کے ضلع انبالہ کے ایک گاؤں پنج لاسہ تحصیل نارائن گڑھ میں دو چوہان بھائی آباد ہوئے۔ایک کا نام مالک چند اور دوسرے کا ملوک چند تھا۔ان میں سے مالک چند نے اسلام قبول کیا۔جس کی نسل سے راؤ کوڑے خان ہوا جس کی نسبت سے ایک قبیلے کا نام کوڑے خان پڑا۔اس کا بیٹا عبدالغنی تھا۔عبدالغنی کا بیٹا اللہ دیا اور اس کا بیٹا راؤ عبد اللّطیف تھا۔''(۶)

راؤ عبداللطیف عاشر وکیل راؤ کے دادا تھے جو تقسیمِ ہند پر اپنا سب کچھ تج کر اپنے نئے وطن پاکستان کے مغربی حصے میں ہجرت کر کے آباد ہوئے۔''پنج لاسہ کے زیادہ تر لوگ چیچہ وطنی ضلع ساہیوال کے گاؤں چک نمبر ۱۶۴/۹۔ایل میں آباد ہوئے۔جن میں آپ کے رشتہ دار بھی تھے''(۷) لیکن آپ اپنے خاندان کے ہمراہ ضلع گجرات (موجودہ منڈی بہاؤالدین) تحصیل پھالیہ کے گاؤں مانگٹ میں آباد ہوئے۔انہیں یہاں کچھ زمین مل گئی جہاں وہ کھیتی باڑی کرنے لگے۔راؤ عبداللطیف کے دو بیٹے تھے۔بڑے کا نام راؤ خلیل احمد اور چھوٹے کا نام راؤ تحسین احمد

تھا۔''راؤ تحسین احمد نے عین جوانی میں جبکہ وہ ایڈیشنل کمشنر کے عہدے پر فائز تھے،وفات پائی۔جبکہ راؤ خلیل احمد زراعت کے محکمہ میں اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔''(۸)راؤ خلیل احمد کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔بڑے بیٹے راؤ شکیل احمد ایف بی آر میں ایڈیشنل کمشنر ہیں۔مانگٹ،سرگودھا اور فیصل آباد میں تعلیم حاصل کی،زرعی یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں،آپ مانگٹ میں ہی پیدا ہوئے۔دوسرے بیٹے وکیل احمد راؤ المعروف عاشر وکیل ہیں۔راؤ خلیل احمد ۱۹۸۲ء میں چیچہ وطنی میں خدمات انجام دے رہے تھے،مانگٹ والی اپنی زمین بیچ دی اور مع بیوی بچوں کے چیچہ وطنی میں اقامت کو ترجیح دی اور بالآخر اسی شہر میں ۲۰ مئی ۱۹۹۹ء کو آپ نے سفرِ آخرت پر مراجعت فرمائی۔

نام:

والدین نے آپ کا نام وکیل احمد رکھا۔لیکن آپ نے ادب میں آتے ہی اسے عاشر وکیل راؤ میں بدل دیا۔اور آج اسی نام سے پہچان رکھتے ہیں۔ولیم شیکسپیئر اپنے ایک ڈرامہ ''رومیو اور جیولیٹ''میں نام کے حوالے سے جیولیٹ کی زبان سے مکالمے کے دوران فلسفیانہ رنگ میں ایک عجیب منطق پیش کرتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

"Thou art thy self though, not a Montagu What's the Montague? It is nor hand, nor foot Nor arm, nor face, nor any other part Belonging to a man. O, be some other name, What's in name? That which we call a rose So Romeo would, where he not Romeo cal'By any name would smell and sweet Retain that dear perfection which he owes Without that tiittle:- Romeo, doff the name."(۹)

شیکسپیئر نے جیولیٹ کی زبانی دو ایسے آفاقی مصرعے کہلوائے جس کی مثال ہر شخص دیتا ہے۔لیکن آنے والے مفکرین نے اس کی مخالفت کی۔ان کا خیال ہے کہ نام کا شخصیت پر بہت اثر پڑتا ہے۔نام کسی بھی شخص کی شخصیت اور انفرادیت کے بارے میں عکاسی کرتا ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ دتا پڑھ کر اے۔ڈی یا سوندھا خان افسر بننے کے بعد ایس۔کے نہ لکھتا۔''سو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اچھا نام رکھنے کی تلقین نہ فرماتے اور بُرا نام رکھنے سے منع فرماتے۔''(۱۰)۔لہٰذا شیکسپیئر کا یہ کہنا کہ''نام میں کیا رکھا ہے؟ آج کے دور اور ہمارے موجودہ معاشرہ میں اپنی وقعت کھو چکا ہے۔

اسی تناظر میں دیکھتے ہوئے خاندانی نام وکیل احمد سے ادبی نام عاشر وکیل راؤ رکھنے والی شخصیت کو اُس کے معروف نام کے حوالے سے جب جانچنے کی کوشش کرتے ہیں تو وکیل کے ساتھ عاشر کا سابقہ اور راو کا لاحقہ تین الفاظ میں ڈھل کر بہت کچھ وضاحت کر دیتے ہیں۔

عاشر کا سابقہ بطور تخلص استعمال کیا گیا ہے حالاں کہ عام طور پر تخلص کو نام کے بعد یعنی لاحقہ کے طور پر لکھا جاتا ہے لیکن عاشر نے روایت سے بغاوت کرتے ہوئے تخلص کا لفظ یعنی عاشر کو نام سے پہلے لکھ کر ایک نئی روایت کو تقویت دی ہے۔یہی وجہ ہے کہ انہیں ملنے والے کئی لوگ وکیل کو ان کا پیشہ گردانتے ہیں اور اُن سے برملا سوال کرتے ہیں کہ کہاں یا کب سے وکالت کر رہے ہیں؟

عاشر کا لفظ کافی سوچ بچار کے بعد بطور تخلص استعمال کیا گیا ہوگا۔حالاں کہ اس کا معنی''دسواں،یعنی شمار میں دسواں حصہ''(۱۱)۔عام فہم میں یہ معنی عشر کے ہیں اور عاشر جو بظاہر اسم فاعل کی صورت دکھائی دیتا ہے۔اس فعل کے کرنے والے یعنی عشر دینے والے کا تصور پیش کرتا ہے۔اسلامی اصطلاح میں عشر وہ فرض یا زکوٰۃ ہے جو زمین کی پیداوار پر دی جاتی ہے اور یہ دسواں حصہ ہوتی ہے۔اسی بنا پر اسے صفتِ عددی کہا گیا ہے۔یہ لفظ احادیث میں کئی بار انہی معانی کی وضاحت میں آیا ہے۔لیکن قرآن مجید میں یہ لفظ اس سے الگ معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے یعنی

جب ہم تلاوت کرتے ہیں ’’عاشروھنّ‘‘ تو اس کا مطلب ہے ’’تم اس کے ساتھ گزران کرو یا برتاؤ کرو اور ’عاشرو معاشرۃ‘، کے معنی باہم زندگی گزارنے کے ہیں۔ارشادِ ربانی ہے ’’عاشروھنَّ بالمعروف‘ ان کے ساتھ تمہارا اچھا رہن سہن ہو۔‘‘(۱۲)۔گویا مرکب بن کر یہ اپنے عددی معنی سے یک دم اصطلاحی معنی میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اسی لفظ کو اگر استعارتاً استعمال کریں تو یہ لفظ ادا کرنے والے اور سخی کے معنی اپنا لیتا ہے۔

ایک اور نکتہ جو ’’عاشر‘‘ کے حوالے سے ذہن میں آتا ہے وہ یہ کہ عاشر، شاعر کا ہم قافیہ ہے۔ جہاں عاشر کے فطری شاعر ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے وہیں یہ فطری طور پر استعمال کرنے کی گواہی بھی ہے۔

وکیل، ادبی نام کا درمیانہ جز اور خاندانی نام کا پہلا حصہ ہے۔ ہمارے ہاں مسلمان گھرانوں میں عموماً جب بچے کا نام رکھا جاتا ہے تو کوشش کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ یا اُس کے محبوب کریم ﷺ کے ذاتی یا صفاتی اسم کو برکت، عقیدت اور محبت کے لیے بچے کے نام کا حصہ بنایا جائے۔اس کے پیچھے خوش بختی اور خوش قسمتی کی منطق بھی ہوتی ہے۔عاشر وکیل راؤ کا نام وکیل احمد ایک تو اس طرف اشارہ کرتا ہے دوسرا یہ روایت کہ بڑے بھائی یا باپ کے نام سے ملتا جلتا یعنی ہم قافیہ نام ہو تو خلیل احمد کے بڑے بیٹے کا نام شکیل احمد ہے لہٰذا چھوٹے بیٹے کا نام وکیل احمد رکھا گیا۔

وکیل چونکہ اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے جس کے معنی ’’نگران، نگہبان، ضامن، گواہ‘‘ (۱۳) ہیں۔قرآن مجید میں یہ لفظ کئی مقامات پر آیا ہے۔ان میں سے دو آیات ’’وھوعلیٰ کل شیٔ وکیل‘‘ (۱۴) اور ’’حسبنا اللہ ونعم الوکیل‘‘ (۱۵)۔کا ورد، اکثر مسلمان اللہ تعالیٰ کی حفاظت، نگرانی اور رحمت کے خواہاں ہونے پر یا اُس کی ذات پر توکل کے اظہار پر کرتے ہیں۔

نام کا تیسرا جز و راؤ ہے جو قومیت کی نسبت سے استعمال کیا گیا ہے۔قومیت کا اظہار اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق پہچان کے لیے ہے، بڑائی کے لیے نہیں۔بہر حال ہندی زبان کا یہ

لفظ راؤ ہمارے ہاں راجپوتوں میں سے اکثر لوگ اپنے نام کے ساتھ اپنی برتری یا پہچان دونوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ راؤ کے معنی راجہ، بادشاہ، سردار، بہادر یا امیر ہیں۔ راجہ راجیسور راؤ اصغر کے مطابق ''عموماً جملہ ہنود میں اور خصوصاً کایستھوں میں ایک لقب ہے جیسے رگھو راؤ وغیرہ۔(۱۶)۔ زبان کے لحاظ سے شاہی افراد جو راجپوتوں میں گزرے ہیں ان کی اولادوں کو عزت و تکریم کی بنا پر راؤ کے خطاب سے پکارا جاتا تھا۔ یوں عاشر وکیل راؤ کے ادبی قلمی نام کے تین الفاظ اپنے اندر لفظی معنی اور اصطلاحی معنی کے حوالے سے اپنی اپنی جگہ پر پورے پس منظر کے حامل ہیں، تاریخ سے بھی آگاہی دیتے ہیں۔ ان میں پوترتا بھی ہے اور اعلیٰ قومیت کا تسلسل بھی۔ ان تین الفاظ نے ایک مکمل نام کی حیثیت اختیار کر کے عاشر وکیل راؤ کے اصل نام وکیل احمد کو اپنے اندر ضم کر کے اسے پردۂ سکرین سے غائب کر دیا ہے اور ایک نئی کیفیت کو جنم دیا ہے اور پھر

روح سے روح کا ہو گیا رابطہ میں مکمل ہوا
مٹ گیا خود سے خود تک کا ہر فاصلہ میں مکمل ہوا
جب تلک خود کو عاشر گنوایا نہیں، خود کو پایا نہیں
اپنی ہستی کو چاہت میں کر کے فنا میں مکمل ہوا

ولادت:

عاشر کے بڑے بھائی راؤ شکیل احمد ۱۹۷۱ء میں جبکہ عاشر وکیل راؤ ۳۰ مئی ۱۹۷۷ء کو موضع مانگٹ تحصیل پھالیہ ضلع گجرات (موجودہ ضلع منڈی بہاؤالدین) میں پیدا ہوئے۔ آپ چھٹے نمبر پر تھے لیکن آپ سے بڑی بہن اور راؤ شکیل احمد سے بڑی ایک بہن وفات پا چکی تھیں۔ لہٰذا زندہ رہنے والوں میں چوتھے نمبر پر ہیں۔ اگر یہ تاریخِ ولادت درست ہے تو وہ دن ''اتوار کا اور سنِ ہجری کے مطابق ۱۰ جمادی الثانی ۱۳۹۷ھ'' (۱۷) ہوسکتا ہے۔

تعلیم وتربیت:

عاشر وکیل راؤ کا بچپن موضع مانگٹ میں اپنی حویلی، اس میں موجود بھائی بہنوں کے لاڈ پیار اور گاؤں کی کچی پکی گلیوں میں عام بچوں کی طرح کھیلتے کودتے گزرا۔ آپ کی عمر ابھی پانچ سال تھی اور یہ عمر اس دور میں سکول جانے کی ہوتی تھی کہ آپ اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے ساتھ چیچہ وطنی منتقل ہو گئے۔

عاشر نے اپنی تعلیم کا آغاز گورنمنٹ پرائمری سکول نمبر ۲، بلاک ۳ چیچہ وطنی سے کیا۔ پرائمری کا امتحان اسی سکول سے پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول چیچہ وطنی میں داخلہ لے لیا جہاں سے آپ نے نویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ آپ کی پھوپھی ضلع سرگودھا کے ایک گاؤں چک نمبر ۳۴ جنوبی میں رہائش پذیر تھیں۔ جن کے خاوند یعنی عاشر کے پھوپھا رانا عبدالغفار چک میں موجود ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ عاشر کے والد بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں بہت حساس واقع ہوئے تھے، راؤ شکیل احمد نے بھی چک نمبر ۳۴ جنوبی کے اسی ہائی سکول سے اپنے پھوپھا کی زیرِ نگرانی میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ لہٰذا اس تجربے کے پیشِ نظر راؤ خلیل احمد نے عاشر کو بھی اپنی بہن اور بہنوئی کے حوالے کر دیا۔ جہاں سے عاشر نے ۱۹۹۴ء میں میٹرک کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ اس سکول میں اپنے جس استاد سے وہ زیادہ متاثر ہوئے وہ جناب طارق کلیم ہیں۔ جو صحافی بھی ہیں، ادیب بھی اور شاعر بھی۔ لیکن یہ ان کی اضافی خوبیاں ہیں۔ طارق کلیم نے بعد میں یونیورسٹی آف سرگودھا سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی اور آج کل گورنمنٹ کالج بھلوال ضلع سرگودھا میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ (۱۸)

عاشر وکیل راؤ کو ہائی سکول میں تعلیم کے دوران مصوری اور خطاطی کا شوق پیدا ہوا۔ جس میں آپ نے کئی مقابلوں میں حصہ بھی لیا لیکن عملی زندگی میں آ کر یہ شوق آہستہ آہستہ کم ہو گئے۔

میٹرک کرنے کے بعد عاشر وکیل راؤ نے گورنمنٹ کالج سرگودھا میں داخلہ لیا۔گورنمنٹ کالج سرگودھا کی ایک روشن تاریخ تھی اور یہ پاکستان کے چند بہترین کالجوں میں شمار ہوتا تھا۔عاشر نے ۱۹۹۹ء میں بی اے اور ۲۰۰۱ء میں ایم اے کے امتحانات پاس کیے۔

گورنمنٹ کالج سرگودھا نے ۲۰۰۲ء میں اپنی حیثیت اور نام کو یونیورسٹی کے قیام اور وقار پر نثار کر دیا۔

عاشر کی ایک ہمشیرہ سرگودھا میں بیاہی ہوئی ہیں۔ایف اے،اور بی اے کی تعلیم کے حصول کے دوران اُن کا قیام ہمشیرہ کے ہاں رہا۔ابھی بی اے کا ریزلٹ نہیں آیا تھا کہ عاشر کو ایک ذہنی اور مالی جھٹکا لگا۔آپ کے والد صاحب وفات پا گئے۔لیکن آپ نے اپنا تعلیمی سفر جاری رکھا۔اسی دوران ۲۰۰۰ء میں آپ کے بھائی اور والدہ نے چیچہ وطنی چھوڑ کر مستقلاً سرگودھا میں رہائش اختیار کر لی۔۲۰۰۸ء میں یونیورسٹی آف سرگودھا کے شعبہ اردو نے ایم فل کے اجراء کا فیصلہ کیا اور کلاسز کا آغاز ہوا۔یونیورسٹی آف سرگودھا کے شعبہ اردو میں ایم فل کا یہ پہلا بیچ تھا۔یوں عاشر وکیل راؤ نے ''اردو میں مزاحمتی شاعری اور ظہیر کاشمیری'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پائنیرز (pioneers) میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔اس کلاس میں اُس کے اساتذہ اور ہم مکتب سکالرز کے بارے بتانا اس لیے ضروری ہے کہ شاید کسی یونیورسٹی میں ایم فل کی ایسی کوئی کلاس ہوئی ہوگی۔جس میں بہت زیادہ سکالرز اور اساتذہ کا تعلق ادب سے ہو اور وہ کئی کئی مطبوعات کے حامل ہوں۔گویا یہ کلاس اپنی نوعیت کی منفرد کلاس تھی۔اس کلاس کے اساتذہ میں:

> ''ڈاکٹر طاہر تونسوی،ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ،ادب میں ان کا مقام و مرتبہ ڈھکا چھپا نہیں،وہ اپنی مطبوعات کی نصف سنچری مکمل کرنے والے ہوں گے۔
>
> ڈاکٹر سید عامر سہیل جنہیں اپنے مضمون پر اچھی گرفت تھی۔وہ اندازاً ۱۷ کتب ترتیب و تالیف کر چکے ہیں،

جب کہ ''انگارے'' ایک خوبصورت پرچہ بھی کئی سال تک
باقاعدگی سے نکالتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر خالد ندیم جن کی تنقیدی، تحقیقی، مترجمہ اور مرتبہ کتب کی
تعداد ایک اندازے کے مطابق دو درجن کے قریب ہو گی۔

ڈاکٹر محمد یار گوندل اپنے کام سے کام رکھنے والے غالباً ان کی
پانچ کتب شائع ہو چکی ہیں۔

ایم فل کے اس پہلے بیچ میں ۲۱ سکالرز نے داخلہ لیا تھا۔جس میں سے سولہ نے مکمل کرنے کے بعد ڈگری حاصل کی۔ان کے نام درج ذیل ہیں:۔

محمد آصف علی، آمنہ بتول، منزہ احتشام، نسیم عباس احمر، شاکر
کنڈان، عاشر وکیل راؤ، شفیق آصف، ارشد ملک، محمد خرم، مقبول نثار ملک،
عابد خورشید۔ یہ تمام سکالرز صاحبِ کتاب ہیں۔

درج بالا سکالرز کے علاوہ باقی پانچ کا ابھی تک کوئی ادبی یا
علمی کام سامنے نہیں آیا۔اور نہ ہی انہیں ادب پڑھانے کے علاوہ کوئی
خاص شوق ہے۔البتہ سب پی۔ایچ۔ڈی سکالرز ہیں۔'' (۱۹)

عاشر وکیل راؤ نے اپنا مقالہ پروفیسر ڈاکٹر سید عامر سہیل موجودہ چیئرمین شعبہ اردو کی نگرانی میں مکمل کیا۔انہیں اس سلسلے میں کئی بار لاہور جانا پڑا۔ظہیر کاشمیری کے اہلِ خانہ یا رشتہ داروں میں سے کسی کے بارے علم نہیں تھا لہٰذا اُن کے احباب اور جاننے والوں سے ملاقاتیں کر کے معلومات اکٹھی کیں۔اسی مقالہ کی تکمیل پر انہیں ۲۰۱۱ء میں ایم فل کی ڈگری ایوارڈ کی گئی۔

ازدواجی زندگی:

عاشر وکیل راؤ کی شادی ارینجڈ (Arranged) نہیں بلکہ محبت کی تھی۔دونوں الگ الگ خاندانوں اور قبیلوں سے ہیں۔راجپوتوں میں یہ رسم چلی آ رہی ہے کہ وہ برادری اور خاندان

سے باہر کم ہی رشتہ کرتے ہیں۔ چیچہ وطنی قیام کے دوران دونوں خاندانوں کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تھا۔ پڑوسی ہونے کے ناطے بھی ایک دوسرے کو دیکھ لینا اور کبھی کبھی شاید بات بھی کر لینا اختیار میں تھا۔لہٰذا انہی چند بے ترتیب ملاقاتوں کے دوران کیوپڈ نے اپنا کام کر دکھایا اور محبت کا احساس اجاگر ہوا۔اسی دوران عہد و پیمان بھی ہوئے۔عاشر نے جب اپنی والدہ اور بہنوں سے ذکر کیا تو سب نے شدت سے اس کی مخالفت کی۔ یہاں تک کہ آپ کے بھائی نے بھی مخالفت کی حالانکہ وہ کافی پڑھے لکھے ہیں اور آج کل ایف بی آر میں ایڈیشنل کمشنر کے عہدے پر فائز ہیں۔لیکن محبت کرنے والوں کی طرف سے کوششیں جاری رہیں۔ایک خاندان والے تو تقریباً رضامند تھے بالآخر عاشر نے بھی اپنے عزیز و اقارب کو کسی نہ کسی صورت راضی کر لیا۔اگرچہ ان کی طرف سے یہ نیم رضامندی تھی پھر بھی عاشر نے اس کا فائدہ اٹھایا اور دسمبر ۲۰۰۴ء کو رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔ بہرحال عاشر وکیل راؤ نے اس محبت کو پانے کے لیے بہت جتن کیے اور پھر کامیابی کا اظہار اپنے اشعار میں بھی کیا۔

کہا اس نے محبت کی یہ سرشاری لگی کیسی
کہا میں نے ریاضت کا صلہ محسوس ہوتی ہے

بعد ازاں اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن ہونے کا اظہار انہوں سے مکالماتی انداز میں کیا۔جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ محبت اور یہ اطمینان یک طرفہ نہیں بلکہ دونوں جانب سے ہے۔

وہ مجھ سے پوچھتی ہے کہ محبت کر کے خوش تو ہو
میں کہتا ہوں یہی اک کام تو اچھا ہوا مجھ سے

کہا اس نے مرے ہونے کا یہ احساس تم ہو، نا!
کہا میں نے کہ جیون کی حسیں ایک آس تم ہو، نا!

اوراب یہ خوشی دوطرفہ نہیں سہ طرفہ لگتی ہے۔یعنی میاں، بیوی اور برادری۔

عام طور پر برادری یا خاندان کسی بھی باہر سے آئی دلہن یا بہو کو آسانی سے تسلیم نہیں کرتا لیکن مسز عاشر نے اپنی ساس، نندوں اور عاشر کے عزیز و اقارب سے وہ رویہ رکھا کہ سب اُس سے خوش ہیں۔ وہ لوگ جو شادی پر راضی نہیں تھے اب وہ عاشر کے اس فیصلے پر مطمئن دکھائی دیتے ہیں۔ عاشر بھی خالص محبت کے قائل ہیں اور انا اور محبت کو اکٹھا نہیں دیکھ سکتے۔اس پر عاشر کو کہنا پڑا:

میرے احساس کو جب سے تو نے چھوا میں مکمل ہوا
بھر گیا میرے اندر تھا جو اک خلا میں مکمل ہوا

فانی دنیا کی ہر چیز رکھتا تھا میں پھر بھی تشنہ تھا میں
غیر فانی محبت ہوئی جب عطا میں مکمل ہوا

تیری چاہت سے جینے کی چاہت ہوئی پوری حسرت ہوئی
پہنچی عرشِ بریں تک مری ہر دعا میں مکمل ہوا

عاشر پر شادی کے بعد اچھے دن بھی آئے اور بُرے بھی۔لیکن بیگم نے ہر موقع پر ساتھ دیا۔اچھے دنوں میں جہاں اللہ تعالیٰ کی ذات کا شکر ادا کیا وہیں بُرے دنوں میں کوئی شکوہ لب پر نہ لا کر خاوند کو حوصلہ اور صبر کی تلقین کی۔

اولاد:

ظفر اقبال کا ایک مصرع ہے
ایک بیوی ہے چار بچے ہیں

عاشر کے حالات بھی اسی مصرعے کے عین مطابق ہیں۔ چاروں بچے نرینہ ہیں۔سب

سے بڑا بیٹا راؤ محمد شافع ساتویں جماعت کا طالب علم ہے لیکن والدین کی خوش قسمتی کہ وہ حافظِ قرآن بھی ہے۔

دوسرا بیٹا عبدالحنان عاشر چھٹی جماعت میں پڑھتا ہے۔

راؤ محمد عبدالہادی پانچویں جماعت اور سب سے چھوٹا بیٹا راؤ میمون عاشر دوسری جماعت کا طالب علم ہے۔

عملی زندگی:

عاشر وکیل راؤ ایک کاروباری ذہن رکھتے ہیں لیکن قدرے سست واقع ہوئے ہیں۔ وہ ایم اے کرنے کے بعد ۲۰۰۳ء سے ۲۰۱۳ء تک خیام چوک میں ایک مرکزی لوکیشن پر الحیات ہوٹل کے پروپرائیٹر رہے۔ ہوٹلنگ کا یہ کاروبار انہیں راس تھا لیکن بدلتے حالات اور رجحان سے ناپسندیدگی کی بنا پر انہوں نے ہوٹل چھوڑ دیا۔ اگرچہ ہوٹل چھوڑنے کا ارادہ وہ پہلے بھی کر چکے تھے اور کچہری روڈ پر ایک ریستوران بھی شروع کر دیا تھا لیکن اس ریستوران میں بھی نقصان اٹھانا پڑا۔ اسی دوران ایک کار خریدی تا کہ اسے کرایہ پر چلا کر گزارا کیا جائے لیکن وہ کار بھی نقصان میں رہی اور اُسے بیچنا پڑا۔ الحیات ہوٹل کے اسی عرصے میں ایک سکول خریدا۔ لیکن خریدنے کے بعد پتا چلا کہ مالکِ مکان نے تو پہلے والے سکول اونر کو مکان خالی کرنے کا نوٹس دے رکھا ہے۔ دوسری جگہ دیکھ کر اسے اسکول کا نمونہ دیا گیا۔ اساتذہ کی تنخواہیں بھی بڑھا دی گئیں لیکن بچے اس نئی جگہ نہ آنے سے چند ماہ کے بعد اسے بھی نقصان اٹھا کر بیچنا پڑا۔ ''اسکول آف وِزڈم' کے نام سے چلایا جانے والا تعلیمی ادارہ کچھ ناتجربہ کاری کا بھی شکار ہوا۔''(۲۰) دراصل وہ سکول کو ہوس اور لالچ سے پاک، خدمت کے جذبے کے تحت چلانا چاہتے تھے۔ جب کہ موجودہ ماحول میں بچوں کو سکول میں داخل کرواتے ہوئے لوگ فیس کو معیار سمجھتے ہیں۔ اگر کسی سکول کی فیس ہزاروں میں ہو گی تو اسے اچھا سکول گنا جائے گا بغیر یہ جانے کہ ایسے سکول ہمارے معاشرے کو خراب اور بچوں کو کم از کم اسلام اور پاکستان سے دور کر رہے ہیں۔

ہوٹل چھوڑنے کے بعد سیٹلائٹ ٹاؤن چوک پر ایک اور ہوٹل لیا۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ اس ہوٹل کے سنوارنے میں پیسہ اور وقت دونوں صرف ہوئے۔ لیکن قسمت نے یاوری نہ کی اور بہت زیادہ نقصان اٹھا کر اسے بند کرنا پڑا۔ بالآخر باہر جا کر قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔ ایک مکان بھلے وقتوں میں خریدا تھا وہ بیچ کر سعودی عرب کے لیے رختِ سفر باندھا۔ عاشر خود بھی ہر سال حج یا عمرے پر جایا کرتے تھے۔ مزید ان کے سالے وہاں ایک مدت سے مقیم تھے۔ عاشر کے پہنچتے ہی سعودی حکومت نے آنے والوں کے لیے قانون میں کچھ سختی کر دی۔ لہٰذا یہاں سے بھی ناکام لوٹنا پڑا۔ واپس آ کر ایک پٹرول پمپ جو ناکارہ حالت میں پڑا تھا ٹھیکے پر لیا اس کی خستگی دور کرنے پر رقم صرف کی۔ اسے مرمت کروایا تب تک پٹرول کی قیمتوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جب پٹرول پمپ نے کام کرنا شروع کیا تو ہر ماہ پٹرول کی قیمتوں میں کمی ہونے لگی۔ ہر مہینہ اچھا خاصا نقصان ہو جاتا یہاں تک کہ ۱۰۲ روپے لیٹر کی قیمت سے کم ہو کر پٹرول کی قیمت ۶۴ روپے فی لیٹر پر آ گئی۔ ہر ماہ پٹرول مہنگا خرید کر سستا بیچنا پڑتا تھا۔ لہٰذا مقروض ہو کر پٹرول پمپ واپس کرنا پڑا۔ اس ساری روداد سے اضافی ایک فقرہ شاکر کنڈان نے لکھا ہے کہ ''عاشر نے گورنمنٹ کالج سرگودھا سے ایم سے کرنے کے بعد چند روز دارِ ارقم میں پڑھایا تھا لیکن پابندی سے اُکتا کر کاروبار شروع کر دیا اور ہوٹلنگ میں کئی سال گزارے۔''۲۱

اس تمام کاروبار میں نقصان اٹھانے، معاشی مسائل اور سوچ نے عاشر کی صحت پر بھی اثر ڈالا۔ ان مسائل کے بارے عاشر کے اس شعر سے ہم اُس کے حوصلے، صبر اور تکالیف کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

کہا اس نے کہ آنکھوں سے یہ سپنے نوچ کیوں ڈالے
کہا میں نے مرے حالات نے مجبور کر ڈالا

پٹرول پمپ واپس کرنے کے بعد عاشر نے خیام چوک کی مارکیٹ میں ہی ایک جنرل اسٹور بنایا۔ اس کی پگڑی اور اس میں سامان وغیرہ پر کافی اخراجات اٹھ گئے۔ مزید اس کا کرایہ اور

دیگر بل ملا کر جتنا ماہانہ خرچ اٹھتا تھا اُس جنرل اسٹور نے اس قدر آمدن نہیں دی اور اسے چلانے کے لیے قرض لینا پڑا۔اور بالآخر کچھ عرصے بعد کافی نقصان کے بعد یہ کاروبار بھی ٹھپ کرنا پڑا۔عام حالات میں ایسے پے در پے نقصانات سے آدمی کا گھبرا جانا فطری ہے لیکن عاشر نے حوصلہ نہیں ہارا اور زندگی کی گاڑی کے ایندھن کے لیے اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے دی گئی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے آج کل عاشر نے پراپرٹی ڈیلنگ کا کام شروع کر رکھا ہے۔

شخصیت:

شخصیت کیا ہے؟ جتنا آسان ہے اتنا ہی الجھا ہوا سوال ہے۔جب کسی شے کے کئی پہلو ہوں اور ہر پہلو کی الگ تعریف کی جاتی ہو تو اسے مجموعی طور پر سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔شخصیت کے بارے میں بھی کچھ ایسا ہے۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ شخصیت نفسیات کا ایک ایسا وسیع اور اہم موضوع ہے جس کے مطالعے کے لیے دیگر موضوعات کو یکجا کرنا پڑتا ہے۔اسی لیے شخصیت کی کئی بہت سی تعریفوں کا جائزہ لے کر عبدالحمید نے جامع طور پر ان الفاظ میں وضاحت کی ہے کہ:

> ''شخصیت فرد کی کم و بیش مستقل اور منفرد خصوصیات کی متحرک تنظیم کا نام ہے۔ان خصوصیات میں فرد کے مخصوص کرداری نمونے،رویے،متحرکات،ہیجانات،میلانات،عقائد اور خیالات وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔وہ گرد و پیش میں ہونے والے واقعات،اشیاء،افراد کے بارے میں مخصوص انداز میں سوچتا ہے۔احساسات کا اظہار کرتا ہے اور خاص ردِعمل پیش کرتا ہے۔''(۲۲)

عبدالحمید کی تعریف کے پس منظر میں عاشر وکیل راؤ کی شخصیت کا اگر جائزہ لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ عاشر کا رویہ ہر شخص کے ساتھ مخلصانہ اور ہمدردانہ ہے۔والد تو اس کی عملی زندگی سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔لیکن والدہ کی اس نے جی بھر کے خدمت کی۔ہمیشہ اُن کی خواہشات کو مقدم رکھا۔والدہ عاشر کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔اور ایک پرہیزگار عورت

تھیں۔اللہ تعالیٰ نے انہیں حج کی سعادت سے بھی نوازا اور اس کے لیے بھی خدمت کی ذمہ داری عاشر کے سر رہی۔ بیوی اور بچوں کے ساتھ بھی وہ محبت اور شفقت کا نمونہ ہے۔ بھائی اور بہنوں سے وہ محبت کرتا ہے۔دوستوں سے،احباب سے اس کی محبت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔خلوص میں وہ انتہا سے بھی آگے چلا جاتا ہے۔غربا کے ساتھ اس کا رویہ مشفقانہ ہوتا ہے۔ہوٹلنگ کے دوران کوئی بھی آنے والا فقیر خالی نہیں جاتا تھا۔وہ زبردستی کھانا کھلواتا۔ہر مہینے ایک مخصوص رقم غربا کو تقسیم کرتا۔الغرض کہ اس کے رویے میں کہیں نفرت اور لالچ کا پہلو نہیں۔

اس نے کبھی کوئی خلافِ اسلام حرکت نہیں کی۔ایک پاک صاف محبت کی اور اسے نبھائے جا رہا ہے۔الحیات ہوٹل جیسے مالی فائدے کے کاروبار کو چھوڑ دینا بھی اسی بنا پر تھا۔کس مپرسی کی زندگی کو قبول کیا لیکن کبھی کسی غلط یا ناجائز طریقے سے دولت کمانے اور امیر بننے کا نہیں سوچا۔ان کا میلان سیاست کی طرف بھی ہے اور مذہب کی طرف بھی۔سیاست میں وہ تحریکِ انصاف سے متعلق ہے اور اس کی وجہ پاکستان سے محبت ہے۔وہ چاہتا ہے کہ پاکستان میں کوئی ایسی حکومت قائم ہو جو انصاف کرے،غربا کے حالات درست کرے،لٹیروں کو ان کی سزائیں دے اور یہ خوبیاں پاکستان تحریکِ انصاف میں دکھائی دیتی ہیں۔مذہباً وہ سنی العقیدہ ہے۔وہ اپنے گردو پیش کے حالات سے آگاہ رہتا ہے۔اس کے سوچنے کا اپنا انداز ہے اور اسی انداز میں وہ شعروں کی صورت گردو پیش کے ان حالات کا،سماج کا اور اپنی سوچ کا اظہار کرتا رہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کا ردِعمل اتنا شدید نہیں ہوتا لیکن کبھی کبھی غلط بات سن کر وہ غصے میں بھی آ جاتا ہے۔اس میں وہ حدود کو پار نہیں کرتا۔دراصل عاشر اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کرنے والا،ایماندار،اللہ تعالیٰ کی ذات سے ڈرنے والا انسان ہے۔اس کے توکل کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے کم وسائل کے باوجود کئی بار حج کیا اور کئی بار عمرے کی سعادت سے سرفراز ہوا۔اور یہ اسباب اللہ جلّ شانہ نے اس کی خواہش کی تکمیل کے لیے کہیں نہ کہیں سے پیدا فرما دیے۔اس کی یہ خواہش کیسے پوری ہوتی ہے بڑی تفصیل طلب ہے۔مختصراً یہ کہ اس میں اور اس کی

ہمشیرہ اور بہنوئی راؤ عبداللہ کا اہم کردار ہے۔(۲۳)

عاشر کے دوستوں سے جب اس سلسلے میں بات کی تو عاشر کی جو تصویر کینوس پر ابھری وہ بھی دیکھنے کے قابل ہے۔ ''خوبصورت اور خوب سیرت عاشر وکیل راؤ جتنا تن کا اجلا ہے اتنا ہی وہ من کا صاف ہے۔''(۲۴) ''جہاں تک توکل کی بات ہے عاشر نے کبھی دولت اکٹھی کرنے یا ضروریات سے زائد کے حصول کی خواہش نہیں کی۔ اسے اس حقیقت پر یقین ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے مقدر میں لکھا ہے وہ مل کر رہے گا۔ حالات کی خستہ حالی کو وہ امتحان سے تعبیر کرتا ہے۔''(۲۵)

اس سلسلے میں عاشر کا اپنا کہنا ہے:

> ''ذاتِ باری تعالیٰ نے مجھے اچھے وقت بھی تو دکھائے ہیں۔ تو آج اگر تنگ دستی سے واسطہ پڑا ہے تو میں گلہ کیوں کروں۔ اس کی طرف سے ایسے امتحانات اپنے بندوں پر آتے رہتے ہیں۔ میں اس کی ذات کا شکر کرتا ہوں کہ اس نے مجھے اپنوں میں تو رکھا ہے۔''(۲۶)

عاشر کی ایمانداری کا معیار یہ ہے کہ اس نے کاروبار میں ہوتے ہوئے بھی کبھی کسی کو دھوکہ نہیں دیا۔ وہ اگر چاہتا تو معاشرے میں دیگر لوگوں کی طرح کئی فوائد اٹھا سکتا تھا۔ اس نے ہوٹل جیسے کاروبار کو صرف اس لیے چھوڑ دیا کہ اسے اس کی آمدن کے جائز ہونے میں شک تھا۔ چوں کہ سارا انتظام مینیجر کے ہاتھ تھا۔ وہ رات کو صرف حساب کتاب چیک کرتا تھا۔ اگر عاشر چاہتا تو اس سے بہت کچھ کما سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ یہ خوفِ خدا ہی ہے کہ وہ غلط کام سے پرہیز کرتا ہے۔ ''وہ پرخلوص ہے۔ وفادار ہے اور سچا ہے۔''(۲۷) ''وہ ہر ایک سے محبت اور عزت سے پیش آتا ہے۔ اخلاقی طور پر وہ محاسن کا مجموعہ ہے۔ وہ سماجی رویوں کی موجودہ صورتِ حال پر کڑھتا ہے۔ وہ سیاست میں تھوڑی بہت دلچسپی لیتا ہے تو اسی وجہ سے کہ ملک میں نظامِ عدل قائم ہو۔ بے راہ روی اور so called روشن خیالی کو لگام ڈالی جائے نیز طبقاتی نظام کو درست کیا

جائے۔''(۲۸)

عاشر وکیل راؤ انٹرنیٹ (سوشل میڈیا) پر بھی مصروفِ کار دکھائی دیتا ہے۔ وہ فیس بک پر ایسی چیزیں شیئر (share) کرتا رہتا ہے جو انسانی زندگی میں مفید ہوں۔ وہ اپنے خیالات و نظریات بھی دوسروں تک پہنچاتا رہتا ہے۔ عاشر کا کہنا ہے کہ:

''یہ سوشل میڈیا کا دور ہے لہٰذا users کو اپنے نظریات کا اظہار whatsapp Face book,Twiter, پر کرتے رہنا چاہیے۔''(۲۹)

پروفیسر سید مرتضیٰ حسن کہتے ہیں:

''عاشر ذاتی طور پر مثبت، با اخلاق، محنت کرنے والا اور ایماندار آدمی ہے۔ انقلابی ذہن رکھتا ہے اور مثبت تبدیلی کا خواہاں ہے۔ پاکستان تحریکِ انصاف کے ساتھ اس کی سیاسی وابستگی ہے اور وہ ایک محبِ وطن شخص ہے۔''(۳۰)

''عاشر ایک اچھا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا انسان بھی ہے۔ بذلہ سنج، لطیفہ گو، ہنس مکھ، مرنجاں مرنج، یاروں کا یار، یہ سبھی اوصاف عاشر کی شخصیت کا خاصہ ہیں۔ عاشر کا حلقۂ احباب ملک بھر میں پھیلا ہوا ہے وہ دوستیاں بناتا اور نبھاتا ہے۔''(۳۱)

''عاشر وکیل راؤ نہایت شفیق اور محبت کرنے والا انسان ہے۔ دوسروں کے دکھ سکھ میں شریک ہونے ولا۔ وہ صرف لفظوں کے ذریعے چاہت کا اظہار نہیں کرتا بلکہ اس کا عملی ثبوت بھی دیتا ہے۔ الحیات ہوٹل پر ہونے والی ادبی بیٹھکوں میں اس کے کئی خوابیدہ اوصاف بھی کھل کر سامنے آئے۔ وہ دوستوں پر جان نچھاور کرنے والا انسان ہے۔ اس

کا ظاہر و باطن ایک سا ہے۔اس نے کبھی کسی کے خلاف نفرت نہیں
پالی۔وہ درگزر کرنے والا انسان ہے۔چپکے سے دوسروں کی مدد کرنے
میں بھی وہ پیش پیش رہتا ہے۔الحیات ہوٹل پر ایک عیسائی کو ملازمت
دے کر اپنے اخلاق سے اُسے اِتنا متاثر کیا کہ اس نے اسلام قبول کر
لیا۔عاشر اسے قیمتی تحائف بھی دیا کرتا تھا۔''(۳۲)

''عاشر جیسا شخص ہزاروں میں ایک ہوتا ہے لیکن اس کی
ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ وہ رات کو جاگتا ہے اور دن کو سوتا ہے لہٰذا ایسا شخص
ہمارے معاشرے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔''(۳۳)

عاشر کا اپنا کہنا ہے کہ ''میں قناعت پسند ہوں۔انسان ہوں سو حسبِ ضرورت جھوٹ بھی بول لیتا ہوں۔مجھ میں ایک یہ خامی بھی ہے کہ سگریٹ بہت پیتا ہوں۔''(۳۴)لیکن انہوں نے اپنی خوبیاں بتانے سے گریز کیا۔

ادبی سرگرمیاں:

عاشر وکیل راؤ ساتویں جماعت کا طالب علم تھا جب پہلا شعر کہا اور یہ اس کے چیچہ وطنی کے ادبی ماحول کا اثر تھا۔کالج میں داخلہ لینے کے بعد ادبی فضا سے واسطہ پڑا۔اساتذہ شاعری کی تربیت طرح مصرعے دے کر اور مقابلے کروا کر کرتے تھے۔عاشر بھی ان مقابلوں میں حصہ لیتا اور دی ہوئی طرح پر غزل کہتا۔جس سے یہ شوق پختہ ہوتا گیا۔ریاضت نے اپنا کام کیا اور ماسٹر تک آتے آتے وہ پختہ کار شاعر ہو گیا۔اس کا شعری مجموعہ ''ابھی امکان باقی ہے'' انہی غزلوں پر مبنی ہے۔

عاشر شعر سے محبت کرتے ہیں۔اچھے شعر کو پسند کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ شعر وہی اچھا ہے جو ایک بار سن کر روح میں اتر جائے اور یادوں میں سما جائے۔گویا وہ شاعری میں سلاست اور روانی کے قائل ہیں۔اور یہی دونوں خوبیاں اُن کے اشعار میں بھی پائی جاتی ہیں۔اس کے آباؤ

اجداد میں کوئی شخص شعروادب سے متعلق نہیں گزرا۔البتہ’’اپنے چچا کے متعلق سنا ضرور ہے کہ اپنے عہدِ جوانی میں وہ شعر کہا کرتے تھے۔لیکن ان کا کوئی شعر سننے یا پڑھنے کو نہیں ملا۔ہاں بڑے بھائی شکیل احمد کبھی کبھی شوقیہ طور پر شعر کہہ لیتے ہیں۔‘‘(۳۵)

عاشر نے جب شعر کہنا شروع کیا تو اسے مختلف رسائل میں اشاعت کے لیے بھیجا۔لہٰذا اب تک وہ اردو کے کئی معروف اور غیر معروف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔جن میں ’’خواتین ڈائجسٹ‘‘،’’کرن‘‘،’’آدا عرض‘‘،’’شعاع‘‘،’’ادبِ لطیف‘‘،’’ادبی دنیا‘‘،’’اسالیب‘‘، ’’ادبیات‘‘،’’بیاض‘‘،’’اوورسیز انٹرنیشنل‘‘،’’اخبارِ جہاں‘‘،’’’ارژنگ‘‘، ’’گلبن‘‘(بھارت)، ’’شاعر‘‘(بھارت)کے علاوہ سعودی عرب اور جرمنی کے کئی رسائل میں ان کی شاعری شائع ہو چکی ہے۔

ایک وقت تھا جب عاشر کو دور دراز کے شہروں سے بھی مشاعرہ پڑھنے کے لیے بلوایا جاتا۔سرگودھا شہر یا قرب و جوار میں تو منعقدہ کسی مشاعرے میں جانا ضروری تھا۔جیسے سرگودھا شہر میں منعقد ہونے والے مختلف ادبی تنظیموں کے مشاعرے،یونیورسٹی آف سرگودھا کے سالانہ مشاعروں کے علاوہ خوشاب،ساہیوال،بھلوال،پھلروان وغیرہ میں مختلف اوقات میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں تو اُن کی شمولیت ہوتی ہی تھی۔انہوں نے پاکستان کے دیگر جن شہروں میں مشاعرے پڑھے ان میں چیچہ وطنی،کسووال،ساہیوال(منٹگمری)، بورے والا، میاں چنوں،کمالیہ،ملتان،کبیر والا،جڑانوالہ،گوجرانوالہ،فیصل آباد،راولپنڈی،اسلام آباد،منڈی بہاؤالدین،گجرات،جہلم،چکوال،راہوالہ وغیرہ شامل ہیں۔

عاشر وکیل راؤ کبھی کسی ادبی تنظیم کے عہدے دار نہیں رہے۔البتہ ۲۰۰۷ء میں شاکر کنڈان کے ساتھ مل کر ’’وصال‘‘ نامی ایک ادبی تنظیم قائم کی۔اس تنظیم نے دو اہم کام کیے۔ایک تو کچھ ادبی نوعیت کے پروگرام منعقد کیے،دوسرا ایک ادبی رسالہ’’وصال‘‘ جاری کیا۔اس تنظیم کی سرگرمیوں کا مرکز الحیات ہوٹل رہا۔ادبی پروگراموں کے علاوہ بھی سرگودھا سے باہر کے ادبا و شعرا

بھی تشریف لاتے تو انہیں ضرور دعوت دی جاتی بلکہ ان کی آمد ہی اسی ہوٹل پر ہوتی، ان کی رہائش اور کھانے پینے کا بھی معقول انتظام کیا جاتا۔ ہر شام کو سرگودھا کے احباب یہاں مل بیٹھتے اور ادب پر گفت و شنید ہوتی۔ روزانہ باقاعدہ یا بے قاعدہ آنے والوں میں ڈاکٹر عامر سہیل، ڈاکٹر شفیق آصف، ڈاکٹر طارق کلیم، شاکر کنڈان، ارشد ملک، ڈاکٹر عابد خورشید، ذوالفقار احسن، پروفیسر یوسف خالد، پروفیسر مرتضیٰ حسن، ارشد محمود ارشد، محمد ندیم، کرنل ارشد (چکوال) جب سرگودھا میں تھے۔ ونگ کمانڈر منیر قاسم (تاندلیانوالہ) جب سرگودھا میں مقیم تھے۔

بیرونِ سرگودھا سے جو شعرا و ادبا وصال کے تحت ہونے والی بڑی تقریبات میں یہاں آئے یا الحیات کی ادبی بیٹھکوں میں کبھی شریک ہوئے ان میں بڑے بڑے نام شامل ہیں۔ ڈاکٹر شفیق آصف کا کہنا ہے:

> ''تعداد کے اعتبار سے وصال نے اگرچہ کم پروگرام کروائے لیکن اس کے جو پروگرام منعقد ہوئے وہ بہت معیاری تھے۔ ان پروگراموں میں سرگودھا شہر، مضافات اور بڑے ادبی مراکز سے بھی شعرا و ادبا نے شرکت کی۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ عاشر اس وقت تک بہت زیادہ فعال رہا جب تک اسے شاکر کنڈان کی رفاقت میسر رہی۔ رفاقت تو خیر آج بھی ان ادبی شخصیات میں موجود ہے تاہم جب سے شاکر کنڈان نے یونیورسٹی جوائن کی تب سے ان کی مصروفیات بڑھ گئیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اب عاشر بھی پہلے جیسے فعال نہیں رہے تاہم اب بھی وہ ادبی تقریبات میں دکھائی دے جاتے ہیں۔'' (۳۶)

جب شاکر کنڈان سے الحیات ہوٹلوں کی بیٹھکوں اور پروگراموں میں آنے والی ادبی شخصیات کے بارے پوچھا تو انہوں نے چند ایک نام تو بتا دیے باقی ان کے حافظے سے غالباً محو ہو چکے ہیں۔ انہوں نے یہ نام اسی ترتیب سے بتائے

سرگودھا سے: اوپر دیے گئے ناموں کے علاوہ میجر عاطف مرزا،ڈاکٹر عابد سیال، قیوم رانا، یونس ارشاد، خالد یوسفی، سلطان علوی،خورشید شاہ پوری، پروفیسر ریاض احمد شاد(مرحوم)، پیرانوار احمد شاہ بخاری، پروفیسر عبدالقادر خان، سید امتیاز حسین بخاری،نسیم اقبال بھٹی،شبیر احمد دلبر،سلیمان جاذب، پروفیسر طارق حبیب، پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال،ارشد محمود ارشد،ڈاکٹر اصغر بلوچ، پیر غلام رسول قاسمی،مشرف حسین انجم،عبیداللہ بیدی، پرویز بزمی(مرحوم)،طفیل ثاقب(مرحوم)، پروفیسر محمد وقاص،عبدالمنیب خالد،محمد یونس خاموش،سلیم حسن مرزا(مرحوم)،صفدر خورشید(مرحوم)،صوفی فقیر محمد(مرحوم)،افتخار عابر،اخلاق عاطف،عترت آسائشی(مرحوم)،عزیز احمد وڑائچ(مرحوم)، مولوی اسلم، ذوالفقار قیس،سید معرفت ہمدانی(مرحوم)،عمر فاروق مونس،اعجاز نادر،اختر وقار بلوچ، ثمینہ گل،منزہ احتشام،احمد ابرار،فرخ اعجاز نصیر۔پھلروان اور بھلوال سے آنے والوں میں جو لوگ شامل تھے ان کے اسما ہیں حنیف ساجد(مرحوم)،افضل گوہر، ذکااللہ ذکا،نعیم ساگر،صابر علی صابر، عابد گوندل،عبدالمنان طاہر،امجد جاوید،شوکت راز(مرحوم)۔سید مبشر آزاد۔خواجہ ادیب ناصر۔

شاہ پور سے آنے والے صرف ایک شاعر قمر الزمان دیپ۔

خوشاب، جوہرآباد سے: افقر بھٹہ،عطا محمد عباسی، ملک شاہ سوار علی ناصر،صاحبزادہ محبوب الرسول، اسد بھٹی،ممتاز ساجد، آصف آس،محمد محمود شاہد،ظہیر بلوچ۔

ساہیوال،فروکہ سے: نظر ملک، ڈاکٹر عنایت بلوچ، اقبال ندیم،فراست علی، اسد اعوان، مسعود تنہا،نصرت بلوچ، احمد نشاط بھائی ظفر۔

لاہور سے : ابرار حنیف مغل، خالد نقاش ایڈووکیٹ، میجر اسلم سیالوی، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر شبیہ الحسن(مرحوم)، ڈاکٹر عبدالکریم خالد، پروفیسر خورشید ہمایوں، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر ناصر رانا، ڈاکٹر عرفان احمد خان۔

جھنگ سے: پیر محمد طاہر حسین، اسد محمود خان، حنیف باوا، ممتاز بلوچ۔

ملتان سے: ندیم بھابھہ، ڈاکٹر خالد اقبال، ناصر ملک، راؤ اصید اسد۔

چکوال سے: شیر دل ساجد،اختر کاظمی،نورزمان ناوک (موحوم)۔

جہلم سے: نصیرکوی۔

کوہاٹ سے: شاہدزمان

ننکانہ صاحب سے: کلیان سنگھ

گجرات سے: احسان فیصل،عدیم یوسفی (مرحوم)،ڈاکٹر حکیم احسان بٹ،ارشد معراج،الطاف بخاری،مشتاق خلیل نصیروی،طارق مفتی۔

اسلام آباد اور راولپنڈی سے: ڈاکٹر محمد حامد،ڈاکٹر کوثر محمود،اختر رضا سلیمی،احمد رضا راجہ،عمران عامی،خالد اعوان، زہیر کنجاہی (مرحوم)،عارف فرہاد،اقبال ظفر ٹوانہ،ماجد وفا عابدی،احمد اصغر راجہ،ریاض عادل،میر تنہا یوسفی۔

کوئٹہ سے: اصغر علی عاصم،حنیف کاشف۔

واہ اور ٹیکسلا سے: سعید دوشی،میجر اسد محمود خان۔

اٹک سے: کیپٹن عبداللہ خان،شوکت محمود شوکت،عقیل ملک۔

میر پور سندھ سے: نوید سروش،یعقوب خاور۔

کراچی سے: محمد مختار احمد غازی،شفیع حیدر دانش،اقدس رضوی۔

فیصل آباد سے: محمد عابد علی عابد،خاور جیلانی،عتیق الرحمان،ڈاکٹر محمد ایوب،محبوب سرمد۔

کمالیہ اور چیچہ وطنی سے: عدنان بشیر،عابد کمالوی،میجر اعظم کمال،آتش کیانی۔

سیالکوٹ اور گجرانوالہ سے: کرنل خالد مصطفیٰ،یعقوب انجم۔

ڈیرہ اسماعیل خان سے: شہاب صفدر

پاکستان سے باہر رہنے والے کچھ اہلِ قلم بھی آئے جن کی شہریت وہیں کی ہے یا پیدائشی اُس ملک کے ہیں جیسے

مصر سے: ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم، برطانیہ سے سلیم مرزا اور اقبال مخلص۔

ناروے سے: ضمیر طالب

سپین سے: نذیر اے قمر

عاشر وکیل راؤ اور ان کے رفیقِ کار جناب سہیل اختر کے دور میں الحیات ہوٹل کو ان حضرات کے علاوہ اور بھی کئی اہلِ قلم کی میز بانی کا شرف حاصل رہا۔''(۳۷)

وصال تنظیم بہت کم عرصے کے لیے متحرک رہی۔''نوجوان شاعروں کی پذیرائی کرتی اور سب سے اہم کو جو مہمان باہر سے آتا 'وصال' اس کے اعزاز میں نشست کا اہتمام کرتی۔''(۳۸) الغرض کہ وصال نے ادب کے فروغ کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کیا، جہاں فن کا اظہار ہوتا، نئی باتیں زیرِ بحث آتیں اور یہاں بیٹھنے والے احباب سیکھنے کے ایک عمل سے گزرتے۔

سہ ماہی ''وصال'':

عاشر وکیل راؤ نے شبیر احمد دلبر کو ایک انٹرویو میں کہا تھا ''صحافت میں بہت کم عرصہ کے لیے رہا وہ بھی کالج دور میں سرگودھا کے ہی دو لوکل اخبارات کا ادبی صفحہ نکالتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد وہ بھی اپنے ایک کلاس فیلو دوست فہیم صابری کے حوالے کر دیا۔''(۳۹) گویا صحافت کا شوق عاشر وکیل راؤ کے اندر کہیں نہ کہیں موجود تھا۔ انہوں نے کالج کے دور میں تھوڑا بہت تجربہ بھی حاصل کیا اور پھر جب وقت ملا تو اپنا ادبی رسالہ سہ ماہی ''وصال'' جاری کیا۔ لیکن اس کے صرف تین شمارے شائع ہوئے۔ چوتھا شمارہ افسانہ نمبر ترتیب دیا تھا لیکن وہ شائع نہ ہو سکا، کیونکہ غمِ روزگار میں اضافہ ہو گیا۔

''وصال'' کا پہلا شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۷ء تھا۔ اس شمارے میں ایک حمد، دو نعتیں، سات مضامین، سات نظمیں، چار افسانے اور اکتیس غزلیں شامل تھیں۔ لکھنے والوں میں کئی بڑے نام، کئی ابھرتے ہوئے نام اور کچھ نو آموز دکھائی دیے۔ لیکن معیار کو سامنے رکھا گیا۔

بڑے ناموں میں ڈاکٹر وزیر آغا،مفتی غلام رسول قاسمی،رفیع الدین ذکی قریشی،شاکر کنڈان،عرفان احمد خان،فرح صابری،زہیر کنجاہی،قمر حجازی،محمود اختر قاضی،خالد فتح محمد، پروفیسر حسن عسکری کاظمی،ڈاکٹر ارشد معراج،رانا سعید دوشی،ڈاکٹر عنایت اللہ،شعیب جاذب،ڈاکٹر سعید اقبال سعدی،ڈاکٹر شفیق آصف،نورزمان ناوک،افضل گوہر،کرامت بخاری،عائشہ مسعود ملک وغیرہ کے نام کے ساتھ ابھرتے ہوئے قلمکاروں میں ارشد ملک،ذوالفقار احسن،عابد عبداللہ،ارشد محمود ارشد،سید مرتضیٰ حسن،اختر رضا سلیمی،عاطف کمال رانا،فیصل ہاشمی،سیدہ توقیر فاطمہ نقوی،سید عظیم واسطی،کنور امتیاز احمد،کاشف مجید،عامر سہیل،ندیم بھابہ،علی زریون اور ضیاء المصطفیٰ جبکہ ادب کے روشن مستقبل میں سید ضمیر بخاری،فرحین چوہدری،فرخ اعجاز نصیر،عظیم حیدر سید،سلیمان بشیر،عدنان بشیر،افضل خان،احمد کامران،احمد سلیم رضی،توقیر تقی اور ثناء اللہ ظہیر جیسے معتبر اور پختہ لکھنے والے شامل ہیں۔عاشر وکیل راؤ اس شمارے کے اداریہ میں ''وصال'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وصال،جس کے تمام معانی ملنا،ملاقات کرنا ہیں۔لیکن لوگ جسے وصل اور ہم بستری سے تعبیر کرتے ہیں۔دراصل موت اور وفات کے معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔اسے جب ہم ایک صوفی کی زبان سے ادا ہوتا دیکھتے ہیں تو اس کی معنوی خوبصورتی کسی اور رنگ میں ظاہر ہوتی ہے۔۔جس میں اللہ تعالیٰ سے ملنے اور ملاقات کی وضاحت ہوتی ہے لہٰذا کوئی جس قدر بھی چاہے انکار کرے لیکن اس ذاتِ واحد،اپنے خالق اور پروردگار سے بہر حال ہم سب کو ملنا ہے۔تو گویا یہاں وصال آپ لوگوں سے ملاقات کا نام بھی ہے اور اپنے انجام کو ہر لمحے یاد رکھنے کا نام بھی۔جسے کبھی بھولنا نہیں چاہیے۔''(۴۰)

اس اقتباس سے قاری عاشر وکیل راؤ کی فکری اپج سے بخوبی آگاہ ہوسکتا ہے۔اسی شمارے سے علوم کے تعارف پر مبنی ایک سلسلہ جاری کیا گیا اور اس حوالے سے پہلا مضمون

ہی ''علمِ ترجیحات'' از مفتی غلام رسول قاسمی بالکل نئی سوچ، نیا انداز اور نئے علم پر مبنی مضمون شامل کیا گیا۔اور اس سلسلے کو جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ ادبا سے اس موضوع پر لکھنے کی بھی درخواست کی گئی۔

وصال کا دوسرا شمارہ ۶ فروری ۲۰۰۸ء تھا۔اس شمارے میں ایک حمد، دو نعتیں، چھ مضامین، سات نظمیں، چھ افسانے، ایک انشائیہ، اڑتیس غزلیں اور دو کتب پر تبصرے شامل تھے۔ بہت سے پہلے شمارے میں لکھنے والوں کے علاوہ نصرت چوہدری، عدیم یوسفی کنجاہی، سعید احمد ہمدانی، آس ثاقب، رؤف نیازی، زہرا نگار، ارشد نعیم، طالب انصاری، جاوید فیروز، ناصر ساحل، آغا گل، احمد صغیر صدیقی، امین جالندھری، حامد سراج، شاہد عمران، ڈاکٹر غلام شبیر رانا، حصیر نوری، صابر عظیم آبادی، اخلاق عاطف، بہزاد جاذب، احمد حسین مجاہد، قمر رضا شہزاد، ڈاکٹر عامر سہیل، شہاب صفدر، ڈاکٹر کوثر محمود، ڈاکٹر عابد سیال، احمد خیال، اسد اعوان، ابرار احمد، ارشد محمود ارشد، شاہد ذکی، مسعود تنہا، ڈاکٹر عصمت درانی، محمد اعظم احساس، شگفتہ نورین، عمران عامی، زاہد آفاق اور احمد عطاء اللہ کی تحریریں شامل تھیں۔ جو لوگ ادب سے وابستہ ہیں وہ ان تمام ناموں سے بخوبی آگاہ ہیں۔

دونوں کتب کے مبصر شاکر کنڈان تھے۔کتب ہیں ڈاکٹر محمد نذیر رانجھا کی ''تذکرہ علمائے چھچھ'' اور مولوی اسلم کا شعری مجموعہ ''آیئے شام ہونے والی ہے۔''

علوم سے آگاہی کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے اس شمارے میں سید احمد ہمدانی کا مضمون ''علم اسرار الحروف (فقر)'' شامل کیا گیا۔

شمارہ نمبر ۳، اگست سے اکتوبر ۲۰۰۸ء تھا۔اس شمارے میں ایک حمد، ایک نعت، ایک دعا، سات مضامین، بیالیس غزلیں، چار افسانے، ایک طنز و مزاح پر مبنی تحریر اور چھ نظمیں شامل تھیں۔

پہلے اور دوسرے شمارے میں لکھنے والے چند ناموں کے علاوہ نئے جو اہلِ قلم ''وصال'' کا حصہ بنے وہ بھی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ان میں درج ذیل نام شامل ہیں۔

مسرور کیفی، غلام زید شوکت، پروفیسر حافظ عبد الصبور، ڈاکٹر شبیہ الحسن، آذر نایاب بدایونی، حسین صحرائی، فہیم احمد، محمد اقبال نجمی، احمد رئیس، عارف شفیق، لیاقت علی عاصم، انور جاوید ہاشمی، جاوید صدیق بھٹی، ممتاز عارف، قیوم طاہر، مشتاق خلیل، امجد شریف، اوصاف شیخ، آصف شہزاد، اسحاق ظفر، علی زین، شاہد بلال حسرت، سید حسنین محسن، خاقان ساجد، خالد محمود اعوان، بہرام طارق، نور محمد ترکی حیلوی اور عاطف کاظمی۔

علوم سے آگاہی کے سلسلے کا نیا مضمون پروفیسر حافظ عبدالصمد کا ''علمِ تصوف'' تھا۔

پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی

تصانیف:

چینی کہاوت ہے کہ ''زندہ رہنا چاہتے ہو تو ایک کتاب لکھ کر چھوڑ جاؤ'' سو اسی کہاوت کو سامنے رکھتے ہوئے عاشر وکیل راؤ نے تین شعری مجموعے شائع کروا لیے ہیں جبکہ چوتھا شعری مجموعہ اشاعت کے لیے تیار ہے۔

عاشر کا پہلا شعری مجموعہ ''ابھی امکان باقی ہے'' تین بار شائع ہو چکا ہے۔ پہلی بار جنوری ۲۰۰۰ء میں شام کے بعد پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا۔ لیکن ایک ماہ کے بعد ہی فروری ۲۰۰۰ء میں اسے دوبارہ اسی پلیٹ فارم سے شائع کرنا پڑا کیوں کہ کتاب مارکیٹ میں دستیاب نہیں تھی۔ اتنا جلدی کسی نو آموز اور وہ بھی طالبِ علم کے شعری مجموعے کا فروخت ہو جانا دلچسپ بات ہے۔ ان دونوں مجموعوں میں صرف تاریخِ اشاعت کے علاوہ کوئی فرق نہیں تھا۔ یہ مجموعہ ایک خوبصورت فطری مناظر والے ٹائٹل کے ساتھ شائع ہوا۔ اندرونی فلیپ پر عاشر کی چاند ردیف والی سات اشعار کی غزل جس میں دو مقطعے تھے درج تھی۔

اس کا نام کیا رکھا چاند
وہ تو سچ مچ نکلا چاند

چاندنی اس کی کب تھی عاشر
سورج کا محتاج تھا چاند

دوسرے فلیپ پر باقی احمد پوری کی رائے اور بیک ٹائٹل پر تصویر کے نیچے دو اشعار درج تھے:

مرے جسمِ بریدہ میں ذرا جو جان باقی ہے
کسی کے لوٹ آنے کا ابھی امکان باقی ہے
ابھی تو درد کے موسم نے عاشر ابتدا کی ہے
کسی کے ہجر کا ہم پر ابھی تاوان باقی ہے

یہ ایک مکمل غزل کتاب میں شامل ہے۔اس غزل کے مطلع کے دوسرے مصرعے میں سے کتاب کا نام اخذ کیا گیا ہے۔کتاب کا انتساب ''اپنے ائیڈیلز امی ابو اور دوست نبیل (مرحوم) اور بھتیجی فاطمہ شکیل کے نام'' ہے۔

کتاب کے کل ۱۶۸ صفحات ہیں۔''محبت کا شاعر'' کے عنوان سے فرحت عباس شاہ نے ابتدائیہ جبکہ ''پہلا قدم'' کے عنوان سے شاعر نے اس کا دیباچہ لکھا ہے۔جس میں بہت سے احباب اور اساتذہ کا شکریہ ادا کیا ہے۔ان ڈھیر سارے ناموں میں ایک نام ''وصال'' بھی ہے۔اگرچہ فہرست سے پہلے تین صفحات پر چار اشعار شامل ہیں لیکن ''پہلا قدم'' کے بعد شاعری کا آغاز ایک دعا سے ہوتا ہے جس کا پہلا شعر ہے

میں نفی ہوں مثبت بنا دے سخی
مجھ کو لفظوں کی حرمت سکھا دے سخی

اس کے بعد نعت:

پھر سامنے ہے غم کی منجدھار یا محمد
تو حوصلے کی دے دے پتوار یا محمد

بعدازاں دونظمیں ابو جی کے لیے اور چچا جی کے لیے شاملِ اشاعت ہیں۔جبکہ یہ سبھی نظمیں غزلیہ ہیئت میں ہیں۔

کتاب کا دوسرا ایڈیشن (مجموعی طور پر تیسری بار) وقارِقلم پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوا۔اس میں سنِ اشاعت درج نہیں لیکن بقول عاشر کے ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔پہلے ایڈیشن میں قیمت ۱۵۰/روپے تھی جبکہ اس ایڈیشن میں اسے کم کر کے ۱۳۰/روپے کر دیا گیا اور بیرونِ ملک کے لیے ۱۲ ڈالر قیمت لکھی گئی۔جبکہ اس ایڈیشن کے صفحات بڑھ کر ۱۷۶ ہو گئے۔ٹائٹل کو فطری مناظر میں رہ کر مزید خوبصورت بنانے کی کوشش کی گئی لیکن پسِ ورق وہی تصویر اور وہی اشعار رہنے دیے گئے۔البتہ فلیپ پر دو غزلیں شامل کی گئیں۔پہلی غزل کا مطلع ہے:

بڑے خاموش رہ کر جو صدائیں مجھ کو دیتا ہے
بڑے سندر سے جذبوں کی قبائیں مجھ کو دیتا ہے

اور دوسرے فلیپ پر موجود غزل کا مطلع ہے:

زندگی جب جاوداں ہونے لگی تم کھو گئے
ہم پہ قسمت مہرباں ہونے لگی تم کھو گئے

انتساب میں پہلے ایڈیشن والی شخصیات کے ساتھ بھانجوں نعمان عبداللہ اور عثمان کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ضابطہ میں دوسرا ایڈیشن نہیں بلکہ بار دوئم لکھا ہے۔جس سے ایڈیشن کا تصور ذہن میں نہیں آتا،لیکن حقیقت میں یہ ایڈیشن ہی ہے۔

ابتدائی مضامین میں فرحت عباس شاہ کے علاوہ باقی احمد پوری ''سچے جذبوں کا شاعر''۔مرزا نصیر خالد ''نئے امکانات کا شاعر'' اور صاحبِ کتاب کا اپنا لکھا ہوا دیباچہ دوسرا قدم اضافی مضامین ہیں۔باقی احمد پوری کی یہ سطور پہلے ایڈیشن کے فلیپ پر رقم تھیں جنہیں یہاں اندرونی صفحات میں شامل کر دیا گیا ہے۔

اختلافِ نسخ:

''ابھی امکان باقی ہے'' کے دونوں ایڈیشنوں میں شعری متن سے باہر کے مندرجہ بالا اختلافات کے علاوہ غزلوں اور شعروں کی کمی بیشی، الفاظ کی تبدیلی، اشعار کی تبدیلی کے کچھ اختلافات بھی موجود ہیں۔

''ابھی امکان باقی ہے'' کے پہلے ایڈیشن میں ایک دعا، ایک نعت، ۴۴ غزلیں، ۱۷ نظمیں، ۴ قطعات، ۱ رباعی اور ۱۴ فردیات ہیں۔ جبکہ دوسرے ایڈیشن میں ابتدائی دعا، نعت، ابو جی کے لیے اور چچا کے لیے دونوں نظمیں اپنے اپنے مقام پر برقرار ہیں۔ غزلوں کی تعداد ۶۵ ہے۔ گویا ایک غزل کم ہوگئی۔ لیکن پہلے ایڈیشن کی ۱۳ غزلیں ایسی ہیں جو دوسرے ایڈیشن میں شامل نہیں کی گئیں۔ اس طرح دوسرے ایڈیشن کی بارہ غزلیں پہلے ایڈیشن کا حصہ نہیں۔ گویا پہلے ایڈیشن کی کمزور غزلوں کو نکال کر ان کی جگہ بہتر غزلیں شامل کرنے اور بہتر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسی طرح پہلے ایڈیشن میں نظموں کی تعداد، ۱۷ ہے جبکہ دوسے ایڈیشن میں یہ تعداد ۱۸ ہوگئی ہے۔ ان میں سے ۱۵ نظمیں تبدیل نہیں کی گئیں۔ دونوں ایڈیشنز میں وہی ہیں۔ البتہ اپنے پہلے ایڈیشن سے دو نظمیں ''میں ہنس لیتا ہوں'' ص ۱۴۴ اور ''ارادہ شناسی'' ص ۱۵۲ کو دوسرے ایڈیشن میں شامل نہیں کیا اور ان کی جگہ ''وہ ایک لمحہ'' ص ۱۸، ''اعجازِ لمس'' ص ۱۰۳ اور ''ابھی تک سانس لیتے ہیں'' ص ۱۰۴ تین نئی نظمیں شامل کر دی گئی ہیں۔

اسی طرح پہلے ایڈیشن کی رباعی دوسرے ایڈیشن میں شامل نہیں کی گئی۔ گویا اس ایڈیشن میں رباعی شامل نہیں۔ قطعات میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ فردیات میں پہلے ایڈیشن میں چھ اشعار ایسے ہیں جنہیں دوسرے ایڈیشن میں شامل نہیں کیا گیا۔

عاشر وکیل راؤ کا دوسرا شعری مجموعہ ''ترا ملنا ضروری ہے'' جسے وقارِ قلم پبلی کیشنز لاہور نے جنوری ۲۰۰۲ء میں شائع کیا۔ ۱۴۴ صفحات پر مشتمل یہ مجموعۂ کلام آفیسٹ پیپر پر ۴ کلر

خوبصورت ٹائٹل اور کچھ صفحات لال رنگ کی چھپائی کے ساتھ بڑے اچھے گیٹ اپ میں شائع کیا گیا ہے۔ڈسٹ کور (dust cover) کے پہلے فلیپ پر اشعار اور دوسرے فلیپ پر ''سپنوں کی کہکشاں''نظم کر دی گئی ہے۔پس ورق پر وصی شاہ کا کیا ہوا تبصرہ کی چند سطریں اور اوپر عاشر کی جوانی کی عمدہ تصویر دی گئی ہے۔کتاب کی قیمت/۱۶۰ روپے اور ۱۰ ڈالر ہے۔کتاب کے دو انتساب دیے گئے ہیں، پہلا انتساب ''عینا کے نام جس کی ذات،عظمت،یقین،وفا،ناموسِ محبت اور اعلیٰ ظرفی کا مجموعہ ہے۔

مقدس ہے وہ عاشر اس قدر معصوم سی صورت
اسے تکنا گنہ ٹھہرا نظر کو بے وضو کر کے

اور دوسرا انتساب ''نورالعین اور معصوم پری کے نام'' ہے۔

والدِ محترم کے لیے'' دو اشعار لکھے ہیں جن میں ان سے اپنے تعلق ان کی فکر اور انجام کا بتایا گیا ہے۔

ابتدا میں پانچ تاثراتی مضامین شامل ہیں۔''محبت کا قتیل۔۔۔عاشر وکیل''مرزا نصیر خالد کا لکھا ہوا ہے۔''زرخیز زمین کا بیٹا''وصی شاہ نے لکھا ہے۔''عاشر وکیل راؤ۔ایک پختہ شاعر''پروفیسر ریاض احمد شاد،''اس کے سچے خواب ہیں''اصغر علی اصغر اور ''خوشبو'' عطاء الرحمان تمثیل کے مضامین ہیں۔اس مجموعے میں اکیالیس غزلیں،۱۷ نظمیں جن میں ''ترا ملنا ضروری ہے''کے عنوان سے دو نظمیں اور دو نثری نظمیں شامل ہیں۔۲۲ فردیات بھی مجموعہ کا حصہ ہیں جن کا ذکر فہرست میں نہیں کیا گیا۔

''ترا ملنا ضراری ہے'' پڑھ کر ایک سوچ ابھرتی ہے کہ یہ مجموعۂ کلام ''ابھی امکان باقی ہے''کا تسلسل اور دوسرا حصہ ہے۔

عاشر وکیل راؤ کا تیسرا شعری مجموعہ ''تم ہؤنا'' ہے۔اس مجموعے میں عاشر نے اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔اور وہ دیگر ہم عصر بلکہ اب تک کے شعراء میں سے الگ نظر آنے لگے

ہیں۔ یہ ان کا تجرباتی کلام ہے جو مکالماتی ہے۔اس مجموعہ کی ابتداء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد ان اشعار سے ہوتی ہے۔

کہا اس نے دعائیں زندگی کی مانگتے کیوں ہو
کہا میں نے مری اس ذات سے منسوب تم ہو نا

کہا اس نے کہ جنت میں خدا سے کس کو مانگو گے
کہا میں نے مرے ہمدم مرے محبوب تم ہو نا

۱۰۸ صفحات پر مشتمل یہ مجموعۂ کلام دعا پبلی کیشنز لاہور نے ۲۰۰۷ء میں شائع کیا۔اس کی قیمت ۱۳۰/ روپے ہے۔اس کتاب کا انتساب ''شاکر کنڈان کے نام اور اپنے فرزندانِ ارجمند محمد شافع اور عبدالحنان عاشر کے نام ہے۔

اس مجموعۂ کلام کی تقریظ شاکر کنڈان نے جبکہ ''جدید اردو غزل کا معمار'' ذوالفقار احسن، 'عاشر وکیل راؤ کا مکالماتی کلام'' شفیق آصف، ''شاعرِ طرحِ نو'' عاشر وکیل راؤ'' اسد اعوان کے تاثراتی مضامین شامل ہیں۔''اپنی بات'' کے عنوان سے عاشر وکیل راؤ نے دیباچہ رقم کیا۔کتاب کے نام کے حوالے سے وہ آگہی دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میرے کچھ احباب کو یہ نام کچھ زیادہ پسند نہیں آیا اور ایک دو نے کہا کہ یہ ایک فلم ''میں ہوں نا'' سے متاثر لگتا ہے جس میں ایک گانے کے بول یہی ہیں۔ مجھے تسلیم ہے کہ مجھے تحریک اسی گانے سے ملی مگر میرا نظریہ اور مقصد اس سے بالکل مختلف ہے کیونکہ محبت حقیقی ہو یا مجازی دونوں صورتوں میں تُو ہی تُو ہوتا ہے نا کہ میں ہی میں۔اور اسی حقیقت کو میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ محبت میں صرف تم ہی تم سب کچھ ہے اور میں کا کوئی سلسلہ نہیں۔''(۳۰)

''تم ہؤنا'' کے پہلے فلیپ پر ایک مکالماتی غزل اور دوسرے فلیپ پر آنے والی کتاب ''میں مکمل ہوا'' سے ایک غزل نقل ہے۔ جبکہ بیک ٹائٹل پہ تصویر اور مکالماتی غزل لکھی گئی ہے۔

زیرِ تذکرہ مجموعۂ کلام کا آغاز ''حمدِ باری تعالیٰ'' اور ''نعتِ رسول ﷺ'' سے ہوا ہے۔ اور یہ دونوں بھی مکالماتی ہیں۔ مجموعہ میں ۲۹ غزلیں، دو نظمیں، ''سپنوں کی کہکشاں'' اور ''تم ہؤنا'' اور سات مفردات ہیں۔ نظمیں دونوں طویل ہیں۔ ''تم ہؤنا'' میں چار مکالماتی غزلیں ''ابھی امکان باقی ہے'' کے پہلے ایڈیشن سے لی گئی ہیں۔ اور ایک غزل اسی مجموعہ کے دوسرے ایڈیشن سے لی گئی ہے۔ جبکہ دو غزلیں اور ایک نظم ''ترا ملنا ضروری ہے'' میں سے لی گئی ہے۔

۴۔ ''میں مکمل ہوا'' یہ غیر مطبوعہ مجموعۂ کلام ہے۔ اگرچہ ''تم ہؤنا'' سے پہلے مکمل ہوا تھا لیکن دوستوں کے کہنے پر اور خاص طور پر شاکر کنڈان کی پذیرائی پر ''تم ہؤنا'' پہلے شائع کرنا پڑا۔ لہٰذا ''میں مکمل ہوا'' ابھی تک تشنۂ اشاعت ہے۔ اس مجموعے میں دو نعتیں، گیارہ نظمیں، ۶ فردیات اور ۶۱ غزلیں ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محمد انصاراللہ، ڈاکٹر، سنسکرت اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع دوم، ۲۰۰۹ء، ص: ۵۸۔

۲۔ Binglay,Captain A.H. A Hand Book on Rajputs,Asian Educational Services,New Dehli,6991.P:3

۳۔ غلام اکبر، ملک، راجپوت تاریخ کے آئینے میں، العقاب پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص: ۱۵۔

۴۔ ایضاً، ص ۵۹، ص: ۶۴۔

۵۔ ایضاً، ص: ۶۵۔

۶۔ راؤ شکیل احمد، مصاحبہ، سرگودھا، ۲۸ جون ۲۱۰۸ء، (عاشر وکیل راؤ کے بڑے بھائی)۔

۷۔ ایضاً۔

۸۔ ایضاً۔

۹۔ William Shakespeare,Romeo amd Juliet,H.M. Cald well company,New York,_0091,P:42

۱۰۔ امتیاز احمد، اسلامی ناموں کا انسائیکلوپیڈیا، دارالاشاعتِ مصطفائی، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص: ۷۔

۱۱۔ نورالحسن نیر، مولوی، نوراللغات، جلد سوم، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، طبع سوم، ۱۹۸۹ء، ص: ۴۹۱۔

۱۲۔ عبدالرشید نعمانی، مولانا، لغات القرآن، جلد چہارم، تالیف: مولانا سید عبدالدائم جلالی، دارالاشاعت کراچی، اپریل ۲۰۰۷ء، ص: ۱۹۶۔

۱۳۔ عبدالرشید نعمانی، مولانا، لغات القرآن، جلد ششم، ایضاً، ص: ۱۳۷۔

۱۴۔ القرآن، سورۃ الاحزاب، ۳۔

۱۵۔ القرآن، سورۃ الزمر، ۶۲۔

۱۶۔ راجیسور اؤ اصغر، راجہ، ہندی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، ص: ۲۷۶۔

۱۷۔ عبدالقدوس ہاشمی، رقویم تاریخی، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد، دوم، ۱۹۸۷ء، ص: ۳۵۰۔

۱۸۔ غلام عباس، پروفیسر ڈاکٹر، مصاحبہ: سرگودھا، ۳۔ مئی ۲۰۱۸ء۔

۱۹۔ عاشر وکیل راؤ، مصاحبہ، سرگودھا، ۱۔ جون ۲۰۱۸ء۔

۲۰۔ شاکر کنڈان، پروفیسر، مصاحبہ، ۵۔ جولائی ۲۰۱۸ء۔

۲۱۔ شاکر کنڈان، پروفیسر، سرگودھا کا دبستانِ شاعری، جلد دوم، اکادمیات: سمن آباد، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص: ۳۷۵

۲۲۔ عبدالحمید، پروفیسر، شخصیت، مشمولہ: نفسیات (بنیادی موضوعات، اطلاقی موضوعات)، از حمیر ہاشمی و دیگر، اردو سائنس بورڈ لاہور، آٹھواں ایڈیشن، ۲۰۱۳ء، ص: ۴۴۵۔

۲۳۔ شاکر کنڈان، مصاحبہ، سرگودھا، ۲۹۔ جون ۲۰۱۸ء۔

۲۴۔ مرزا نصیر خالد، محبت کا قتیل۔۔۔ عاشر وکیل، مشمولہ: ترا ملنا ضروری ہے، وقارِ قلم پبلی کیشنز، لاہور، جنوری ۲۰۰۲ء، ص: ۱۴۔

۲۵۔ ملک شاہ سوار علی ناصر، مصاحبہ، خوشاب، ۲۸۔ جون ۲۰۱۸ء۔

۲۶۔ عاشر وکیل راؤ، مصاحبہ، سرگودھا، ۱۵۔ جون ۲۰۸۱ء۔

۲۷۔ فرحت عباس شاہ، محبت کا شاعر، مشمولہ، ابھی امکان باقی ہے، از: عاشر وکیل، شام کے بعد پبلی کیشنز، لاہور، فروری ۲۰۰۰ء، ص ۱۲۔

۲۸۔ امتیاز احمد، مصاحبہ، خوشاب، ۲۸۔ جون، ۲۰۱۸ء۔

۲۹۔ عاشر وکیل راؤ، مصاحبہ، سرگودھا۔

۳۰۔ مرتضیٰ حسن، پروفیسر سید مصاحبہ، سرگودھا، ۲۷۔ اپریل، ۲۰۱۸ء۔

۳۱۔ اسد اعوان، شاعرِ طرحِ نو عاشر وکیل راؤ، ۱۱ فروری ۲۰۰۷ء، مشمولہ: تم ہو نا، از: عاشر وکیل راؤ، دعا پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۶۔ ۲۷۔

۳۲۔ ذوالفقار احسن، مصاحبہ، سرگودھا، ۲۰۔ اپریل ۲۰۱۸ء۔

۳۳۔ ارشد ملک، مصاحبہ، سرگودھا۔ ۱۹۔ اپریل ۲۰۱۸ء۔

۳۴۔ عاشر وکیل راؤ، مصاحبہ، سرگودھا۔

۳۵۔ عاشر وکیل راؤ مصاحبہ، سرگودھا۔

۳۶۔ شفیق آصف، پروفیسر ڈاکٹر، مصاحبہ، سرگودھا، ۲۸۔ اپریل ۲۰۱۸ء۔

۳۷۔ شاکر کنڈان، مصاحبہ، سرگودھا، ۲۴ جون ۲۰۱۸ء۔

۳۸۔ ارشد محمود ارشد، مصاحبہ، سرگودھا، ۲۸۔ اپریل ۲۰۱۸ء۔

۳۹۔ شبیر احمد دلبر، انٹرویو عاشر وکیل راؤ، مشمولہ ماہنامہ اوورسیز انٹرنیشنل، اسلام آباد، جلد، ۱۶، شمارہ ۳، نومبر، ۲۰۰۷ء، ص: ۴۲۔

۴۰۔ عاشر وکیل راؤ، اداریہ، مشمولہ سہ ماہی ''وصال'' سرگودھا، شمارہ نمبر ا، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۷ء، ص: ۵۔

باب دوم

عاشر وکیل راؤ کی غزل کا فکری جائزہ

قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر افلا تتفکرون اور افلا یتفکرون کے الفاظ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے۔ کائنات کی کوئی چیز بغیر مقصد کے پیدا نہیں کی گئی۔ ہر شے میں کوئی نہ کوئی بات پنہاں ہے۔ بقول اقبال نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں۔ رب کی پیدا کردہ ہر چیز میں کوئی حکمت ہے۔ کائنات کی ہر شے کا کوئی نہ کوئی موضوع ہے۔ خیال اظہار کا محرک ہے۔ لیکن خیال کے اظہار کے لیے الفاظ وسیلہ بنتے ہیں۔ ہم سوچتے بھی ہیں تو الفاظ ہمارے ذہن میں گردش کر رہے ہوتے ہیں۔ خیالات، احساسات، مشاہدات و تجربات کا ایک خاص پیرائے میں اظہار شاعری ہے۔ غزل کی فکر سے مراد غزل کے موضوعات ہوتے ہیں۔ موضوع، فکر یا خیال کسی بھی فن پارے کا محرک اور پہلا مرحلہ ہوتا ہے۔

> ''ہر تحریر کسی نہ کسی خیال پر مبنی ہوتی ہے۔ خیال کی آفرینش اسلوب سے مقدم ہے البتہ اسلوب خیال سازی کے عمل کے بعد کا خمیر یا تعمیری عمل ہے۔ لازم نہیں کہ خیال اسلوب کی تعمیر کرے مگر یہ حقیقت ہے کہ خیال اسلوب میں وہی اہمیت رکھتا ہے جو جسم میں روح کی ہوتی ہے۔''(۱)

ناقدین نے اسلوب پر خیال کو ترجیح دی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ موضوع کے بدلنے سے اسلوب بدل جاتا ہے۔ اردو ادب میں اصناف کی تقسیم موضوع اور ہیئت کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ حمد، نعت، سلام، ہجو وغیرہ موضوعی ہیں جبکہ قطعہ، رباعی، مسدس، مخمس، نظم آزاد

وغیرہ ایک خاص ہیئت میں موجود ہیں،لہٰذا یہ ہیئتی اصناف ہیں۔ہیئتی اصناف میں کوئی خاص موضوع نہیں ہوتا لہٰذا غزل کو بھی ہیئتی صنف میں شمار کرنا چاہیے۔آغاز میں غزل کے موضوعات خاصے محدود تھے مثلاً حسن وعشق،تصوف،وعظ ونصیحت،دنیا کی بے ثباتی وغیرہ مگر آج غزل موضوعات میں بہت آگے بڑھ چکی ہے اور ہر طرح کا موضوع اس میں سما گیا ہے،مزید یہ کہ غزل کا لفظ سنتے ہی ہمارے ذہنوں میں اس کی ہیئت آتی ہے (مطلع،مقطع،قافیہ،ردیف) اسی لیے اسے ہیئت میں شمار کرنا چاہیے۔شمیم احمد نے غزل کو ''ہیئتی صنف'' (۲) کہا ہے۔

اس تقسیم سے ہمارے ہاں ادب میں دو نظریے سامنے آئے۔ایک فن برائے فن،دوسرا فن برائے زندگی۔عاشر وکیل راؤ فن برائے زندگی کے قائل ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ ''ادب میں نام نہاد جدیدیت جس میں ابہام ہی ابہام ہے،ایسی جدیدیت کا میں قائل نہیں۔'' (۳) ان کے ہاں مقصدی شاعری ہے۔عاشر کی شاعری کے غالب موضوعات عشق و محبت،وجودیت اور عصری حسیت ہیں۔

عشق کے معانی واقسام:

محبت عربی زبان کا لفظ ہے۔اس کے لئے پیار،الفت،عشق وغیرہ الفاظ سے بھی مستعمل ہیں۔یہ ایک ایسا دلی جذبہ ہے جو غیر اختیاری ہوتا ہے۔جب محبت میں شدت پیدا ہو جائے تو عشق کہلاتا ہے۔قرآن میں لفظ ''عشق'' کسی مقام پر نہیں آیا البتہ سورہ البقرہ میں ''حُبّ'' اور ''اشدّ'' کے الفاظ آئے ہیں جو محبت کی شدت کو ظاہر کرتے ہیں۔والّذینَ اٰمَنُو اشدّ حب اللہ۔(۴)

عشق کی دو بنیادی اقسام ہیں،۱۔عشقِ حقیقی،۲۔عشقِ مجازی۔''دل کے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہونے کو عشقِ حقیقی کہا جاتا ہے۔عشقِ حقیقی وہ بلند و بالا مقام ہے انسان جہاں پہنچ کر عالمِ ارواح سے لے کر حیاتِ جاوید تک زمین سے لے کر آٹھویں آسمان تک،عرش تک،سدرۃ المنتہیٰ تک،جنت دوزخ تک،اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ تمام خزانوں تک،اللہ تعالیٰ کی پوری کائنات تک حتیٰ

کہ اللہ تعالیٰ کے قُرب تک آسانی سے پہنچ سکتا ہے۔''(۵)عشق حقیقی خدا سے بندے کی محبت ہے۔اللہ خود اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے۔وہ ستّر ماؤں سے بڑھ کر اپنے بندوں سے پیار کرتا ہے۔جب اللہ اور اس کے کسی پیارے کے درمیان محبت شدید ہو جاتی ہے،اور وہ شخص سب کچھ اپنے اللہ کے لئے کرتا ہے،خود کو اس کے سپرد کر دیتا ہے،اس کی رضا میں راضی رہتا ہے،اس کا ہر عمل ربّ کے لئے ہو جاتا ہے تو اس حالت کو عشقِ حقیقی کہا جاتا ہے۔اسے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دنیا اس کے بارے کیا سوچتی ہے،کیا کہتی ہے۔عشقِ حقیقی میں بندہ اللہ کی محبت پاتا ہے،ذریعہ ربّ کے نیکوکار بندے جنہیں اولیا کہا جاتا ہے بنتے ہیں،ان کی صفات کا ذکر کرتے ہوئے رب تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔''خبردار! بے شک اولیاء اللہ پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ رنجیدہ و غمگین ہوں گے۔''(۶)''وہ ایسے لوگ ہیں جو ایمان لائے اور (ہمیشہ) تقویٰ شعار رہے۔''(۷)وہ مکارمِ اخلاق کا پیکر ہوتے ہیں،حقوق اللہ اور حقوق العباد کا خیال رکھتے ہیں،وہ خدا کے دوست ہوتے ہیں،صراطِ مستقیم پر چلتے ہیں،رسول اللہ ﷺ سے محبت اور ان کی اطاعت کرتے ہیں ، کیونکہ رسول کی اطاعت ہی اللہ کی اطاعت ہے اور خدا اور بندے کے درمیان بہترین وسیلہ رسول ہوتا ہے جس پر وحی اترتی ہے۔ہمارے ہاں بہت سے روحانی سلاسل موجود ہیں(مثلاً نقشبندی،سہروردی،قادری،نظامی،چشتی،سیالوی،اویسی وغیرہ) جو انسانوں کے احوال و اخلاق کی اصلاح کرتے ہیں۔مرشد،رُشد و ہدایت کا فریضہ انجام دیتا ہے،مرید کے قلب و باطن کا تزکیہ کرتا ہے، یہ سلاسل رسول اللہ ﷺ سے جا ملتے ہیں۔یوں مریدین ربّ کا قرب پاتے ہیں۔

عشقِ مجازی کا تعلق دنیاوی محبوب سے ہے جو گوشت پوست کا انسان ہوتا ہے،اسی لئے بہت سوں نے مجازی عشق میں جنسیت کو اہم سمجھا۔ایک آدمی کی عورت سے محبت یا ایک عورت کی آدمی سے محبت مجازی محبت ہے۔

اردو ادب کی روایت میں تصورِ عشق و محبت:

اردو غزل چونکہ عربی قصیدے کی تشبیب سے الگ کی گئی ہے اور قصیدے کی تشبیب کا

آہنگ عشقیہ تھا سو عشق ومحبت اس کا بنیادی موضوع ٹھہرا۔فارسی شعرا نے اس موضوع کو کثرت سے غزل میں برتا،جس میں عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی ہر دو طرح کے پہلو سامنے آئے۔گویا اردو غزل کی روایت میں یہ موضوع ابتدائی ہے۔ولیؔ عشق کو عقل پر ترجیح دیتا ہے۔''ولی بھی اسی روایت کے پیرو کار ہیں مگر اس فرق کے ساتھ کہ وہ عقل کو سرے سے ردّ نہیں کرتے بلکہ اس کی بعض صورتوں اور بعض مواقع پر اس کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔جنون وخرد کی ایک تقسیم تو ولیؔ کے ہاں یہ ملتی ہے کہ عقل حسن اور حسن کے حوالے سے گویا محبوب کی ایک صفت ہے۔جبکہ جنون و وحشت ان کے نزدیک عشق اور اہالیانِ عشق کی صفات ہیں۔مثلاً

ولیؔ گل رو کی دانش پر نظر کر
بہارِ حسن کو چنداں بقا نئیں(۸)

اردو غزل کا عاشق صحرانورد ہے جو عشق کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہتا ہے۔اسی لئے اردو غزل میں قیس مجنوں کا ذکر بار بار آتا ہے۔اردو شاعری میں عاشق کو پروانہ بھی کہا گیا ہے جو اپنے دیے کی لو کے لئے اپنی جان تک دے دیتا ہے۔سچا عاشق ایثار وقربانی کا جذبہ رکھتا ہے۔سراج الدین اورنگ آبادی کے نزدیک انسان کے پاس عشق ومحبت کا ظرف ہے،اسی لئے فرشتوں سے بہتر ہے۔

محبت کے نشے میں خاص انساں واسطے ورنہ
فرشتے یہ شرابیں پی کے مستانے ہوئے ہوتے

سراج عشق کو عقل پر افضل سمجھتے ہیں۔وہ اپنی غزلوں میں عشق کی راہ کے آلام و مصائب اور مشکلات کو بیان کرتے ہیں اور عشق کے راستے کو بہت پُر خار قرار دیتے ہیں۔سوداؔ حسن وعشق کی عمر کا موازنہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ عشق کی عمر حسن سے طویل ہے۔

سوداؔ یہ قصہ خط سے نہ کوتاہ ہو سکے
ہے حسن زلفِ یار سے عمرِ دراز عشق

وہ عشق و محبت کی راہ کو پُر خطر بتاتے ہیں۔عشق میں عزت کے بجائے رسوائی ہے مگر عاشق اسی میں لذت پاتا ہے۔اس راہ میں قدم قدم پر ٹھوکریں ہیں۔محبت کرنے والوں کے خلاف دنیا باتیں کرتی ہے۔اہلِ دنیا شروع سے ہی دو محبت کرنے والوں کے درمیان دیوار کا کردار ادا کرتے ہیں۔سودا کے نزدیک عشق و محبت وقت گزاری نہیں بلکہ یہ صاحب کردار لوگوں کا شیوہ ہے۔

میرؔ کے ہاں عشق و محبت ایک بڑا موضوع ہے۔میرؔ کے دیوانِ اوّل سے دیوانِ پنجم تک مسلسل ایسی غزلیں ہیں جن کی ردیف 'عشق' ہے۔عشق کا سبق میرؔ صاحب کو اپنے والد سے ملا تھا جس کا ذکر ڈاکٹر سعد اللہ کلیم ''ذکرِ میر'' کے حوالے سے یوں کرتے ہیں:

> ''بیٹا عشق کرو۔عشق ہی اس کارخانہ ہستی کو چلانے والا ہے۔عشق میں جی جان کی بازی لگا دینا ہی کمال ہے۔عشق ہی بناتا ہے۔عشق ہی جلا کر کندن کرتا ہے۔جو کچھ ہے وہ عشق ہی کا ظہور ہے۔آگ میں سوزش، پانی میں روانی، خاک میں قرار، ہوا میں اضطرار عشق ہی سے ہے۔موت عشق کی مستی اور زندگی اس کی ہوشیاری ہے دن عشق کی بیداری اور رات اس کی نیند ہے۔مسلمان عشق کا جمال اور کافر عشق کا جلال ہے۔نیکی عشق کا قرب اور گناہ اس سے دوری ہے۔عشق کا مقام و مرتبہ بندگی سے، زہد و عرفان سے، سچائی اور خلوص سے، اشتیاق اور وجدان سے بلند و بالا ہے۔بعض کے نزدیک عشق ہی سے آسمانوں کی گردش ہے یعنی وہ اپنے محبوب تک پہنچنے کی دھن میں سرگرداں ہے۔''(۹)

> میرؔ کے نزدیک عشق ہی سب کچھ ہے

> ''بندے سے خدا تک سب روپ عشق کے ہیں۔عشق خود ہی معشوق اور خود ہی عاشق ہے۔وہ مدعی بھی ہے اور مدعا بھی ہے۔دشمنِ

جاں بھی ہے اور دلکش و جانفزا بھی ہے۔۔۔حق شناسوں کے نزدیک عشق خدا ہے۔۔۔عشق سے کوئی جگہ خالی نہیں۔دل سے تا بہ عرش عشق ہی عشق ہے۔عشق ایک توانائی ہے جو فرہاد کے اندر بروئے کار آئے تو پہاڑ کاٹ دیتی ہے، عشق کے بغیر مقصود تک رسائی محال ہے۔''(۱۰)

میرؔ ادب کو عشق کی دین سمجھتا ہے، وہ کہتا ہے عشق بن یہ ادب نہیں آتا۔عاشقی میں عزتِ سادات بھی چلی جاتی ہے۔ان کے مطابق وفا، ایثار، احترامِ دوست، ادب، صداقت وغیرہ عاشق کے اوصاف ہیں۔میرؔ عشق اور ہوس کو دو مختلف کیفیات کہتے ہیں۔

اب تو تو لڑکا نہیں عشق و ہوس میں کر تمیز
آشنا سے فرق ہوتا ہے بہت نا آشنا

خواجہ میر دردؔ کا رجحان عشقِ حقیقی کی طرف رہا۔وہ ایک صوفی تھے اور سلسلۂ نقشبند سے تعلق رکھتے تھے۔ان کا مسلک وحدت الوجودی تھا۔وہ ہر جگہ خدا کی ذات کو دیکھتے ہیں۔مگر کہیں کہیں وہ عشقِ مجازی اور اس سے متعلقہ شعر بھی کہتے ہیں۔

اوروں سے تو ہنستا ہے نظروں سے ملا نظریں
ایدھر کو نگہ کوئی پھینکے ہے تو دزدیدہ

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا

مصحفی غزل کے لئے بنیادی جذبہ عشق کو قرار دیتے ہیں، وہ عشق کو دل سوزی و دل گیری کہتے ہیں ان کے مطابق یہ ایثار و قربانی کا عمل ہے۔حسن و عشق پر سینکڑوں اشعار ان کے ہاں موجود ہیں۔لیکن اس معاملے میں ان پر لکھنوی رنگ غالب ہے۔جنسیات سے متعلق اشعار بھی کہے۔ان کے بہت سے affairs بھی منظرِ عام پر آئے، جنس سے بڑا لگاؤ تھا، جس کا اثر ان کی

شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔غزلوں میں معاملہ بندی اور فحش گوئی کا گمان گزرتا ہے۔ان کی تالیف ''مجمع الفوائد'' میں ان کی جنسی زندگی کے بارے معلومات موجود ہیں۔ان کی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد کئی عورتوں سے ناجائز تعلقات بنے۔

جمنا میں کل نہا کر جب اس نے بال باندھے
ہم نے بھی اپنے جی میں کیا کیا خیال باندھے

انشااللہ خان انشا کے ہاں عشق مجاز سے حقیقت کا سفر کرتا ہے، گویا عشقِ مجازی، عشقِ حقیقی کی سیڑھی ہے۔وہ کہتے ہیں

ہے یاں وہ نخلِ عشق میں دیوانہ پن کی شاخ
جس سے اُگے نہال اویس قرن کی شاخ

سعداللہ کلیم کے بقول ''مجاز کو دیوانگی کی راہ سے گزر کر حقیقت میں پہنچانے والا اس سے زیادہ بھرپور شعر شاید ہی اردو غزل میں نظر آئے۔''(۱۱) وہ عشق کو رہنما جانتے ہیں، عشق کو علم پر اور عاشق کو عالم پر افضل قرار دیتے ہیں۔بہادر شاہ ظفر بھی اس معاملے میں ان کے ہم خیال ہیں۔ان کے ایک شعر کا مفہوم ہے کہ جب کبھی واعظ پہ عشق کا ایک نقطہ بھی واضح ہو گیا تو وہ اپنی کتابیں دریا بُرد کر دے گا۔مولانا روم کا معروف واقعہ ہے، جب شاہ شمس تبریزی ان کے مدرسے میں گئے تو مولانا روم طلبہ کو فقہ کا درس دے رہے تھے۔حضرت شمس تبریزی نے ان کی وہ نایاب درسی کتابیں اٹھائیں اور مدرسے کے حوض میں پھینک دیں جس پر مولانا بہت غصّے ہوئے، کچھ دیر بعد شاہ شمس نے ان کتابوں کو پانی سے نکالا تو وہ بالکل خشک تھیں، یہ دیکھ کر مولانا نے کتابیں چھوڑیں اور ان کا دامن تھام لیا اور پھر یہ کہتے پائے گئے۔

مولوی ہرگز نشد مولائے روم
تا غلامِ شمس تبریزی نشد

غالب کے ہاں وہی روایتی عشق و محبت کا رویّہ ہے۔وہ اس کی شدت کو بیان کرتے

ہوئے کہتے ہیں عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی۔۔۔ان کے ہاں یہ انفرادی پہلو ہے کہ وہ عشق اور فلسفے کی آمیزش سے نئے پن کو سامنے لائے ہیں۔ان کے ہاں عقل وجنون کی ملی جلی حالتوں کا ذکر ہے جسے بعد ازاں اقبال نے اپنی شاعری میں مزید فروغ دیا۔حالی چونکہ سرسید تحریک کے سرگرم کارکن تھے،ان کے ہاں نیچری رنگ نمایاں ہوتا ہے۔وہ ''مقدمہ شعروشاعری'' میں غزل کے عشقیہ موضوع پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شاعروں کو چاہیے کہ صرف عورت (محبوبہ) کا ذکر نہ کریں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اسے وسعت دیں۔اپنے والدین،اولاد،رشتہ داروں سے محبت کو بھی موضوعِ غزل بنایا جائے۔وہ عشق کی تخریب کاریوں کو بھی شعروں کی صورت سامنے لاتے ہیں۔

اے عشق تُو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا

جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا

اقبال کے ہاں عشق ومحبت ایک بڑا موضوع ہے۔وہ سوئی ہوئی قوم کو جگاتے اور جمود سے متحرک کرتے ہیں۔ان کے ہاں عشق حرکت بسوئے منزل ہے۔عشق ہی سے زندگی میں زیرو بم ہے۔وہ مومن کو شاہین کہتے ہیں اور اسے بلندیوں کی طرف پرواز کرنے کی طرف راغب کرتے ہیں۔عشق زمانہ ساز نہیں بلکہ یہ زمانے سے ستیز کی ایک صورت ہے۔علامہ کے ہاں عشق تہذیب کی اساسی قدر بن جاتی ہے۔زندگی اور موت کا مفہوم بدل جاتا ہے۔اقبال کے مطابق عشق سے کفر بھی مسلمان ہو جاتا ہے اور عشق نہ ہو تو مسلمان بھی کافر و زندیق ہے۔عشق شہنشاہی کے اسرار و رموز کھولتا ہے۔عشق خدا کی دین ہے۔اس زمین وآسماں کی بے کرانی کے قصے کو عشق ایک جست میں تمام کر دیتا ہے۔علامہ اپنی اصل،اپنی تہذیب،اپنی ملّت،اور رسول اللہ ﷺ سے عشق ومحبت کی بات کرتے ہیں۔جہاد پر زور دیتے ہیں۔عشق نام ہی فنا ہونے کا ہے۔جب یہ صورت ہو تو بدر و حنین بھی عشق بن جاتا ہے۔وہ عشقِ رسول ﷺ کو ایسی قوت کہتے ہیں جو ہر پست کو بالا کر دیتی ہے۔

علامہ عقل و عشق کا موازنہ کرتے ہیں اور عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں۔ جہاں عقل محوِ تماشا ہوتی ہے وہاں عشق بے خطر آگ میں کود جاتا ہے۔ عقل چالاک ہے جبکہ عشق نہ ملّا ہے نہ زاہد ہے اور نہ ہی فقیر۔ عقل و خرد اور منطق کی بات کرنے والے علامہ رازی پر مولانا روم بازی لے جاتے ہیں۔ اقبال عقل و عشق کا فرق یوں بیان کرتے ہیں۔

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

اقبال نثری تحریروں میں تو عقلی علوم کو ایک حد تک اہمیت دیتے ہیں مگر ''شذراتِ اقبال'' میں ''شاعری اور منطقی صداقت'' کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ

> ''شاعری میں منطقی صداقت کی تلاش فضول ہے۔ تخیل کا نصب العین حسن ہے نہ کہ صداقت۔ کسی شاعر کی عظمت کے ثبوت میں اس کلام کے وہ نمونے پیش نہ کیجئے جو آپ کی رائے میں سائنسی صداقت کے ترجمان ہیں۔'' (۱۲)

عقل والوں کو تنقید سے فرصت نہیں لہذا وہ اعمال کی بنیاد عشق پر رکھنے پہ راغب کرتے ہیں۔ عقل چراغِ راہ تو ہے مگر منزل نہیں۔

مولانا حسرت موہانی عشق کو سببِ تزکیہ و تصفیۂ نفس قرار دیتے ہیں جو انسان کے قلب و باطن کی صفائی کرتا ہے، اسے بُرے کاموں سے دور کر کے اچھائیوں کی طرف راغب کرتا ہے۔ بااخلاق اور باکردار بناتا ہے۔

سیہ کار تھے با صفا ہو گئے ہم
ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم

انہوں نے اسے بازار اور کوٹھوں سے نکال کر ایک درست سمت دی ہے۔ ایک نئی جہت سے روشناس کروایا ہے جو عم زاد کا عشق ہے۔ وہ joint family system کی بات

کرتے ہیں۔خاندان میں عشق ومحبت کوطبعی محبت کا نام بھی دیا گیا ہے۔مولانا حُسن کوعشق کا جزوِ لازم کہتے ہیں۔فیض کے ہاں وطن سے محبت کا پہلو بہت نمایاں ہے۔پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے بعد دھرتی ماں سے محبت کا اثر دنیا کے ادب میں اپنی جگہ بناتا دکھائی دیتا ہے۔مجموعی طور پر دیکھیں تو صبر وقناعت،فریاد اور گلہ نہ کرنا،سب کچھ سہہ کر خاموش رہنا،نیاز مندی،عاجزی،خود سپردگی،ایثار وقربانی،اطاعت وفرماں برداری۔ادب و احترام،بلندی و رفعت عشق ومحبت کی اخلاقیات اور ایک سچے پیار کرنے والے کی صفات ہیں۔

عاشر کا تصورِ عشق ومحبت:

شاعری کسی بھی شاعر کے احساسات اور جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ورڈز ورتھ کہتا ہے شاعری سکون کے عالم میں کسی جذبے کی بازگشت ہے۔جس سمت شاعر کا میلان ہوگا اس کے شعروں میں بھی وہی رجحان نظر آئے گا۔عاشر محبت کرنے والا شخص ہے اور اس کی شاعری کا بڑا موضوع محبت ہے۔جذبۂ محبت شاعری کی تحریک دیتا ہے۔''شاعری کا محرک یا تو خداداد فطری عطیہ ہوتا ہے یا دیوانگی کا ہلکا سا اثر''۔(۱۳)عاشر کو یہی جذبہ شعر کہنے پر ابھارتا ہے۔

تمہارے وصل کے لمحوں کو شعروں میں پروتا ہوں
انہیں پھر گنگناتا ہوں تو دل میں پھول کھلتے ہیں

ان کے ہاں محبت زندگی کی ایک اہم قدر ہے۔اس کی اہمیت ہر شے سے زیادہ ہے۔اسی سے دنیا میں رونق ہے۔

زندگی کی تمام رعنائیاں اسی محبت کی بدولت ہیں۔ڈاکٹر شفیق آصف اپنے انٹرویو میں کہتے ہیں''عاشر کا بڑا موضوع محبت ہے،لیکن ان کے ہاں محبت محدود نہیں۔ان کی محبت انسان سے کائنات تک پھیلی ہوئی ہے۔''(۱۴)''دیگر نوجوان شعرا کی طرح محبت اس کا بھی مسئلہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں قدم قدم پر محبت کا رنگ نظر آتا ہے اور یہ رنگ اتنا گہرا ہے کہ نفرت کا رنگ کسی طور بھی اس پر غالب ہوتا نظر نہیں آتا۔''(۱۵)عطاء الرحمان تمثیل،ریاض

احمد شاد، مرزا نصیر خالد، وصی شاہ، فرحت عباس شاہ، باقی احمد پوری، شاکر کنڈان، اسد اعوان، ذوالفقار احسن، ارشد ملک، مرتضیٰ حسن اور ارشد محمود ارشد نے بھی یہی thesis بنایا کہ محبت ہی عاشر کی شاعری کا بڑا موضوع ہے۔ عاشر کے ہاں محبت فیض رساں جذبہ ہے۔ اس کے نزدیک محبت سے خالی دل بنجر زمین کی مانند ہے۔

وہ جن کی سرزمینِ دل سدا بنجر ہی رہتی ہے
وہاں پر پھول کی صورت کوئی جذبہ نہیں کھلتا

دل، مقامِ محبت ہے۔ اقبال دلِ مردہ کو دل ہی نہیں مانتے تھے۔ عاشر کہتے ہیں کہ محبت میں یہ طاقت ہے کہ وہ آدمی کو انسان بناتی ہے، غرور و تکبر سے نجات دلاتی، عاجزی سکھاتی اور اخلاقِ مکارم سے نوازتی ہے۔

کہا اس نے محبت کی وکالت کس لیے عاشر
کہا میں نے محبت ہی ہمیں انساں بناتی ہے

محبت کی ابتدا دل کی لگی سے ہوتی ہے۔ دل کی لگی میں شدت محبت کو جنم دیتی ہے۔ محمد عبدالرحمان کمیانہ دل لگی اور دل کی لگی کو دو مختلف کیفیتیں سمجھتے ہیں

> ''دل لگی اور دل کی لگی میں یہ فرق ہے کہ دل لگی محض ٹائم پاس کرنے کے لیے لوگ کرتے ہیں جیسے بلبل کبھی اِس درخت پر کبھی اُس درخت پر آتی جاتی رہتی ہے۔ دل لگی کرنے والا شخص ایک قسم کا دھوکے باز، عیاش اور ہوس پرست ہوتا ہے۔ جب وہ اپنی ہوس پوری کر لیتا ہے تو وہ جس کو ہوس کا شکار بناتا ہے اس کے پاس دوبارہ نہیں آتا اور جب عزت سے ہاتھ دھونے والا شخص اسے کہتا ہے کہ تم مجھ سے بے انتہا پیار کرتے تھے تو وہ کہتا ہے کہ کیا میرا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ مگر دل لگی سے ہٹ کر دل کی لگی بالکل مختلف حالت ہے کہ جب دو چاہنے والے ایک

دوسرے سے پیار کرنا شروع کر دیتے ہیں تو پیار ترقی کرتا کرتا محبت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور جب محبت حد سے بڑھ جاتی ہے تو دونوں پیار کرنے والے منظرِ عام پر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جیسے کسی نے کیا خوب کہا عشق اور مشک چھپانے سے نہیں چھپتے۔''(۱۶)

عاشر نے اسے شعری پیرائے میں یوں ڈھالا ہے۔

کہا اس نے تمہارے سامنے میں ہونٹ سی لوں گی
کہا میں نے نہیں چھپتے کبھی جذبے چھپانے سے

محبت کے لیے منصوبہ بندی نہیں کرنا پڑتی۔ یہ ہو جاتی ہے۔ یہ ایک فطری جذبہ ہے جو جوانی میں اپنے عروج پہ ہوتا ہے۔ پتا نہیں چلتا محبت کب اور کس سے ہو جائے۔ عاشر کے ہاں محبت ایک نشاطیہ رجحان ہے۔ محبت میں بہت سی باتیں ان کہی ہوتی ہیں۔ عاشق جب محبوب سے ملنے جاتا ہے تو بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہے مگر محبوب کے سامنے جا کر اس کا چہرہ ہی دیکھتا رہتا ہے اور باتیں ان کہی رہ جاتی ہیں۔

کس قدر انوکھا ہے ضابطہ محبت کا
کب نجانے ہو جائے معجزہ محبت کا

بہت سی ان کہی باتیں، تصور میں، ترے لب سے
میں خود کو ہی سناتا ہوں تو دل میں پھول کھلتے ہیں

محبت میں بہت سی تکالیف برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ جب پیار کے دشمن لوگوں کو علم ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو ان کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کے بیچ دیواریں ڈالنا شروع کر دیتے ہیں، انہیں جدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے رستے میں کانٹے بچھاتے ہیں مگر دو محبت کرنے والے ان مصائب کو برداشت کرتے رہتے ہیں اور محبت کرنا

نہیں چھوڑتے۔اس عمل سے ان دونوں میں ضبط کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔محبت صبر و استقلال عطا کرتی ہے۔اس سے زندگی میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔پھر عاشق ومحبوب کو صرصر بھی صبا محسوس ہوتی ہے۔

کہا اس نے محبت درد کی فصلیں اُگاتی ہے
کہا میں نے کہ پہلی شرط ہی یہ کرب سہنا ہے

اک کربِ مسلسل میں رہ کر، ہر ظلم محبت میں سہہ کر
کچھ اور نکھرتے رہتے ہیں، ہم پھر بھی ہنستے رہتے ہیں

کہا اس نے کسی دل پر محبت مہرباں ہو تو
کہا میں نے کہ صرصر بھی صبا محسوس ہوتی ہے

عاشر محبت میں خلوص اور وفا کو لازم عناصر سمجھتے ہیں۔ان کے نزدیک محبت اور ہوس ایک دوسرے کی ضد ہیں۔۔محبت کی کیفیات،سرشاری اور نوازشات کا ذکر مشاہدے اور تجربے کی بنا پر کرتے ہیں۔ان کی محبت پاکیزہ ہے۔وہ محبوب کی عصمت و حیا کو کسی طور نظرانداز نہیں کرتے۔وصی شاہ اپنے ایک تاثراتی مضمون میں لکھتا ہے:

''عاشر کی شاعری میں مجھے جو بات سب سے زیادہ Haunt کرتی ہے وہ عاشر کی سوچ کی پاکیزگی اور معصومیت ہے اور محبت میں تقدس صرف سچی محبت کرنے والے ہی کی میراث ہوا کرتا ہے۔''(۱۷)

زندہ رہنے کو جیسے ہوا شرط ہے
اس محبت میں ایسے وفا شرط ہے

مقدس ہے وہ عاشر اس قدر معصوم سی صورت
اسے تکنا گنہ ٹھہرا نظر کو بے وضو کر کے

عاشر محبت کو تکمیلِ ذات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔گویا کاملیت کی منزل کی سیڑھی محبت ہے۔ایک عاشق اپنے محبوب کو ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہے۔محبوب کی خوشی محب کی خوشی ہوتی ہے۔محبت جب شدید ہو جائے تو یہ عشق کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔عشق میں عاشق ہر وقت اپنے معشوق کو سوچتا رہتا ہے،اس کے خیالوں میں ہر وقت محبوب کا خوبصورت پیکر اور کانوں میں اس کی رس بھری آواز گونجتی رہتی ہے۔گویا معشوق اس کے دل و دماغ پر سوار ہو جاتا ہے۔ایک عاشق کے لیے سب سے اہم اور قیمتی شے اس کا محبوب ہوتا ہے۔وہ اپنی ساری خوشیاں اپنے معشوق کے ایک اشارے پر قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔اب معشوق کی رضا عاشق کی رضا بن جاتی ہے۔دونوں ایک دوسرے کا عکس نما معلوم ہوتے ہیں۔

تمہیں دیکھا،تمہیں سوچا،تمہیں چاہا،تمہیں مانا
تمہارے عشق میں کھو کر ہوئے یوں پارسا ہیں ہم

تری خوشی کے لیے لٹا دوں
میں اپنے ایسے ہزار جیون

عشق میں شدت آئے تو جنون کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔پھر عاشق مجنوں کی طرح در در پھرتا ہے۔وہ پاگلوں کی طرح اپنے معشوق کو ڈھونڈتا اور اسے ایک نظر دیکھنے کو بے تاب رہتا ہے۔مجنوں عاشق کے لیے جان دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔اس کو سود و زیاں سے مطلب نہیں رہتا۔وہ وحشت کی حالت کو پہنچ جاتا ہے۔

جو تم نے آزمانے کو جدائی شرط رکھی ہے
کہیں ایسا نہ ہو میرا جنوں تکمیل کر ڈالے

کہااس نے تمہارے اس جنوں سے خوف آتا ہے
کہا میں نے نہیں ڈرتے محبت کے دوانے سے

عاشر کا تصورِ عاشق و محبوب:

محبت کرنے والے کو محب اور جس سے محبت کی جائے اسے محبوب کہا جاتا ہے۔محبوب کے لیے کسی ایک محب کا ہونا ضروری نہیں بلکہ وہ ایسے کمالات والا ہونا چاہیے جس سے محبت ہو جائے۔ باوفا محبوب دلدار، نورِ نظر، دکھ درد کو بانٹنے والا اور عزیز ہوتا ہے۔ جہاں تک اردو غزل کی روایت میں محبوب کے تصور کا معاملہ ہے تو اردو کلاسیکی شاعری کا محبوب بے وفا ہے، بے رخی اور بے اعتنائی برتتا ہے، عاشق پر ظلم کرتا ہے، اس سے صحیح سے بات نہیں کرتا۔اس کو رویہ اپنے عاشق کے ساتھ بُرا رہا ہے۔عاشق پر محبوب کے لگائے زخم نہیں بھرتے۔

اس کے برعکس عاشق ہر وقت اپنے محبوب کو یاد کرتا، اس کے خیالوں میں گم رہتا اور اس کی فکر کرتا ہے۔اس کی خوشی کے لیے اپنی خوشیاں تج دیتا اور آسانیوں کو چھوڑ دیتا ہے۔اس میں ایثار وقربانی کا جذبہ موجود ہے۔عاشق کے لیے محبوب کے بول آب حیات کا درجہ رکھتے ہیں۔وہ اپنے محبوب کا وصال طلب کرتا رہتا ہے۔جدائی کے لمحات اسے کانٹوں کی طرح چبھتے ہیں۔اردو روایتی شاعری کا محبوب اپنے عاشق سے بے نیاز ہے۔یہی عاشق ہمیں عاشر کے ہاں ملتا ہے۔

گرچہ ہزار زخم ملے اس کے ہاتھ سے
لیکن یہ اور بات کرم بھی جفا میں تھا

عاشق اپنے محبوب کی رضا میں راضی رہتا ہے۔وہ محبوب کے مظالم برداشت کرتا رہتا ہے۔وہی بے رخی، بے اعتنائی، بے نیازی، اور دل دکھانے والا محبوب کا رونا عاشر روتے ہیں۔ان کے ہاں محبوب وعدہ شکن ہے۔جو عاشق کو نظر انداز کرتا ہے۔جس پر وہ محبوب سے شکوے کے انداز میں بات کرتے نظر آتے ہیں۔

جس دل میں آپ کے سوا کوئی نہیں سجن
اس دل کو اس قدر تو دکھایا نہ کیجیے

جن رتوں میں لوٹ کر آنے کا وعدہ تھا ترا
کٹ گئیں کتنی رُتیں اب ان رتوں کے بعد بھی

جس نے سراب بخشے، جس نے عذاب بخشے
دل آج بھی ہے اس کا محکوم، جانتا ہوں

محبوب کے بُرے رویے کے باوجود عاشق کے دل میں اس کی قدر و محبت موجود رہتی ہے۔

عاشر کا محبوب گوشت پوشت کا انسان ہے۔ جو کہ ایک عورت ہے۔ ان کے ہاں محبوب کے لیے صیغۂ مؤنث ہے۔ اس محبوبہ کا چہرہ حسین ہے اور ہاتھ مہندی سے سجے ہوئے ہیں۔ عاشر کے ہاں ایک نیک اور باحیا محبوبہ کا تصور ہے۔ ان کی محبوبہ نہ صرف اخلاقی خوبیوں سے متصف ہے بلکہ وہ ظاہری حسن اور خوبیاں بھی رکھتی ہے۔ ایسا حسن جو دلکش ہے اور آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ اس حسن کے مقابل دیگر حسین مناظر کم درجے کے ہیں۔

حیا کی کہکشاں، جیسی ترے چہرے پہ کھلتی ہے
یہاں پر پھول کھلتا ہے مگر ایسا نہیں کِھلتا

سارے دلکش مناظر ہوئے اک طرف
ہاں مگر تیرا چہرہ ہے اپنی طرف

وجودیت:

بیسویں صدی کو نئے علوم کی صدی کہا جاتا ہے۔جدید ٹیکنالوجی اور سائنسی ایجادات نے ایک انقلاب برپا کیا اور ان کے اثرات پوری دنیا اور عالمی ادب پر پڑے۔ان اثرات سے بیسویں صدی کے ادب میں چند نئے رجحانات سامنے آئے جن میں تصوف،علامتیت،جنسیت اور وجودیت نمایاں رہے۔وجودیت کے لیے انگریزی میں Existentiolism کا لفظ مستعمل ہے۔جیسا کہ نام سے ظاہر ہے وجودیت، انسانی وجود کی اہمیت کا موضوع ہے۔اگرچہ وجودیت کا آغاز انیسویں صدی میں ہو چکا تھا البتہ اس تحریک نے بیسویں صدی میں زور پکڑا۔انقلابِ فرانس، عالمی جنگیں،نئی ٹیکنالوجی کا استعمال، ہیروشیما اور ناگا ساکی پر بمباری، سائنسی و تکنیکی ثقافت، ہندو مسلم فسادات، ۱۹۴۷ء کی ہجرت تباہی و بربادی کو اپنے ساتھ لائی، ان سب کا اثر یہ ہوا کہ انسانوں میں خوف اور دہشت، بے یقینی اور مایوسی کی فضا پھیلی اور لوگ سینکڑوں نفسیاتی پریشانوں کا شکار ہوئے۔

یہی وہ دور تھا جب وجودیت کی ترویج ہوئی اور انسان کے مندرجہ بالا مسائل وجودیت کے مباحث بنے۔پہلے پہل یورپ میں وجودیت پر مباحثے ہوئے بعد ازاں یہ پوری دنیا میں ایک تحریک کے طور پر ابھری۔ہربرٹ سپنسر نے زندگی کے داخلی و خارجی رشتوں کی اہمیت واضح کی۔ڈارون بندر سے انسانی وجود کے متشکل ہونے کی بات کرتا ہے۔ہیگل نے زندگی کو جدلیاتی تحرک سے تعبیر کرتے ہوئے thesis اور anti-thesis کی تھیوری پیش کی۔کیرکے گور نے انسان کے شعور کا تجزیہ کرتے ہوئے وجود کو جوہر پر ترجیح دی۔نٹشے انسانی قوت پر زور دیتے ہوئے سپر مین کا نظریہ پیش کرتا ہے۔پاسکل کہتا ہے ''میں ہوں، اس لیے میں سوچتا ہوں۔'' جبکہ ڈیکارٹ کہتا ہے ''میں سوچتا ہوں، اس لیے میں ہوں''۔یوں اس نے شعور کو ترجیح دی۔فرائڈ اور ژونگ انسانی شعور، لاشعور اور تحت الشعور اور اجتماعی لاشعور کو زیرِ بحث لاتے ہیں۔سارتر نے وجودیت پر خاصا کام کیا۔اس کے خطبات "Being and Nothingness" کے نام سے کتابی صورت میں

شائع ہو چکے ہیں۔اس کے علاوہ کامیو، کافکا، رلکے، دوستو وسکی، جبریل مارسل، رچرڈ کرونز اور ٹیلش وغیرہ نے وجودیت کی ترویج واشاعت کی اور اسے ادب میں جگہ دی۔ان کے ناولوں میں وجودی مسائل کا ذکر موجود ہے۔

وجودیوں کے مطابق انسان آزاد ہے۔اسے اپنے فیصلے کرنے کا پورا حق ہے، وہ اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔وجودیت جماعت کے بجائے فرد کو اہمیت دیتی ہے۔آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ اس بھری دنیا میں اس کی انفرادیت کہاں ہے؟ انفرادیت اس کا تشخص بحال کرتی ہے اور اسے حوصلہ دیتی ہے۔انسانی شعور کو اہم سمجھتی ہے۔فلسفہ وجودیت کو شعورِ ذات اور اثباتِ ذات کا فلسفہ بھی کہا گیا۔پروفیسر محمد جلیل الرحمان کی نظر میں انسانی شعور سب سے اہم ہے۔وہ اپنے مضمون ''عصری ادب میں وجودی فکر کا ارتقاء'' میں رقم طراز ہیں کہ ''کائنات کے تمام مظاہر انسانی شعور کی بدولت حقیقت رکھتے ہیں ورنہ ان کی موجودگی بے معنی ہے۔'' (۱۸) وجودیوں کے ہاں دو طبقے ہیں ایک دینی جس کی نمائندگی کیر کے گورنے کی اور دوسرا لادینی جس کا لیڈر ژاں پال سارتر ہے۔نٹشے جو خدا کا منکر تھا اور جس کا معروف قول ہے کہ ''خدا مر چکا ہے''، لادینی طبقے کا فرد تھا۔البتہ دونوں طبقات سماجی واخلاقی اقدار کو اہم گردانتے ہیں۔

identity-crises کا مسئلہ آئے دن بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔انسان نے خود کو کھو دیا ہے۔اسی لیے بہت سے مسائل کا شکار ہے۔سارتر کہتا ہے ''ادب زندگی کا آئینہ نہیں بلکہ یہ انسان کے وجود کو ثابت کرنے کا اہم ترین وسیلہ ہے اور ادیب کردار تخلیق نہیں کرتا بلکہ ان کی مدد سے اپنے ہی وجود کا سراغ لگاتا ہے۔'' (۱۹)

بیسویں صدی کی سیاسی وسماجی صورتِ حال کی وجہ سے وجود کا مسئلہ زیرِ بحث آیا۔یہ موضوع انگریزی اور اردو ناولوں اور افسانوں کے علاوہ شاعری کا حصہ بھی بنا۔بالخصوص ۱۹۶۰ء کے بعد کی اردو شاعری میں وجودی نظریہ ابھر کر سامنے آیا۔منیر نیازی، ناصر کاظمی، احمد مشتاق، بشیر بدر، عرفان صدیقی، ظفر اقبال اور ندا فاضلی وغیرہ کے ہاں ایسے اشعار کی بہتات ہے۔

عاشر کی غزل میں ایسے بہت سے اشعار ہیں جس میں شناخت کے کھو جانے کا مسئلہ مذکور ہے۔ وہ اس طرح خود کو تلاشنے میں لگا ہوا ہے جیسے کوئی بچہ اپنے گمے ہوئے کھلونے کو تلاش کرتا ہے۔ وہ مکالماتی طرز میں بھی اس مسئلے کو اجاگر کرتا دکھائی دیتا ہے۔

میں اپنے آپ کو ہی ڈھونڈتا ہوں اس طرح جیسے
کوئی بچہ کہیں رکھ کر کھلونا بھول جاتا ہے

وہ کہتی ہے کہ ہر لمحہ نئی الجھن سی رہتی ہے
میں کہتا ہوں کہ اپنی ذات میں دلدل نہ ہو جانا

کہا اس نے مرے اندر مسلسل ٹوٹ جاری ہے
کہا میں نے کہیں ایسا نہ ہو خود کو گنوا لو تم

وجودیوں نے جوہر پر وجود کو فوقیت دی۔ وجودیت کا میلان داخلیت کی طرف ہے۔ یہ داخلی جذبات، احساسات اور کیفیات کو بیان کرتی ہے۔ جمیل جالبی نے اسے یوں بیان کیا۔

''یہ فلسفہ دراصل ان مروجہ اور روایتی فلسفیوں کے خلاف ایک ردّ عمل تھا جن میں فلسفہ اشیا اور خیالات کا مرکز بن کر مجرد اور بے جان بحثوں میں الجھ کر رہ گیا تھا اور جس کا زندگی، فرد اور اس کے مسائل سے دور کا بھی واسطہ نہ رہا تھا۔ وجودیت نے لوگوں کو محسوس کرایا کہ داخلی رویہ خارجی حقیقت کو بدل سکتا ہے۔'' (۲۰)

افتخار بیگ اپنی کتاب ''وجودیت'' میں کرب، بوریت، گھن، مایوسی، موت اور خوشی کو وجودیت کے مسائل قرار دیتے ہیں۔ وجودیت نے عقلی پہلوؤں کے بجائے جذبی پہلوؤں پر زور

دیا ہے۔نصرت نبی لکھتی ہیں:

''وجودیت پسندوں کا مرکز انسانی وجود اور اس کے مسائل ہیں۔یہ مسائل انسانی کرب، الجھن، کشاکش، بیزاری، تنہائی، علیحدگی، بیگانگی،خوف،دہشت،پشیمانی،پریشانی،مایوسی،محرومی،بے کسی،بے چارگی،لایعنیت ،بے مقصدیت سے تعلق رکھتے ہیں۔''(۲۱)

یادِ ماضی بھی وجودیت کا مضمون ہے۔

انہی وجودی مسائل کا ذکر عاشر کی شاعری میں موجود ہے۔یاد رہے کہ وجودیت نے فکر وخیال پر زور دیا،جس کی وجہ سے رومانویت کے عناصر بھی اس میں شامل ہو گئے۔

ا۔تنہائی:

نئی ٹیکنالوجی نے آپسی دوریوں کو جنم دیا ہے۔اس میں یہ قوت نہیں کہ یہ انسانوں کے درمیان محبت کو رواج دے سکے۔البتہ اس نے تنہائی اور اکلاپے میں اضافہ کیا۔تنہائی میں اضافے کا ایک سبب نوآبادیاتی نظام ہے۔نئے شہر آباد ہونے اور نئی کالونیوں کے بننے سے انسان تنہائی کا شکار ہوا ہے۔گاؤں میں سب ایک ساتھ رہتے تھے،سب کے دکھ سکھ سانجھے ہوتے تھے مگر نوآبادیاتی نظام نے قوم کو افراد بنا دیا ہے۔شہروں میں ایک ہی محلے کے لوگ ایک دوسرے سے نا آشنا ہیں۔ہر شخص کو صرف اپنے کام سے مطلب ہے۔ایک ہی گھر کے افراد اکٹھے نہیں بیٹھتے۔انسان اکلاپے کے عذاب سے دوچار ہے۔

اتنا ہی احساس بڑھے تنہائی کا
جتنے زیادہ گھر میں کمرے ہوتے ہیں

تنہائی کوئی نیا مضمون نہیں۔اس کا احساس حضرت آدم کو بھی تھا۔البتہ آج اس کے اسباب اور ہیں۔آج کا انسان بھیڑ میں تنہا ہے۔لطف الرحمان اس کے مسائل کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''موجودہ عہد میں تنہائی فضائے زندگی پر محیط ایک ہمہ گیر تجربہ ہے۔ یہ انتشار کا عہد ہے دیرینہ روحانی اور اخلاقی قدروں کی برہمی کے ساتھ ساتھ طویل مشترکہ تاریخی، تہذیبی، قومی، معاشرتی، اساطیری اور جذباتی و ذہنی ہم آہنگی کی ساری روایتیں منہدم ہو چکی ہیں۔ فرد مشین بن چکا ہے یا ایک بڑی مشین کا ادنیٰ سا پرزہ جو ایک محدود دائرے میں حرکت پر مجبور ہے۔ مشین کوئی زندہ دھڑکتا ہوا وجود نہیں رکھتی۔ نہ وہ خواب دیکھ سکتی ہے اور نہ اس میں جذبۂ محبت اور تخلیقی اُپج کی صلاحیت ہے۔''(۲۲)

عاشر کے نزدیک تنہائی کی ایک وجہ دوستوں کی بے وفائی اور مظالم ہیں۔ اپنوں کی تکلیف سے زیادہ دکھ پہنچتا ہے۔ جب اپنے ہی دھوکہ دیں تو انسان کا اعتبار اُٹھ جاتا ہے، پھر وہ تنہا رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔

کہا اس نے کہ اُس جیسا کوئی تنہا نہیں دیکھا
کہا میں نے تعلقات کا مارا ہوا ہو گا

نہ ستارے نہ جگنو نہ میرا قمر
رحم آنے لگا اپنی تنہائی پر

۲۔اداسی:

نئی ٹیکنالوجی، نیا نظامِ حیات اور تنہائی، اداسی کا باعث بنیں۔ جدید غزل میں یہ مضمون بڑی تیزی سے داخل ہوا۔ عاشر کے ایک شعر کا مفہوم ہے کہ عاشق و محبوب ایک شہر میں رہتے ہوئے بھی اتنا دور ہو گئے ہیں کہ انھیں قاصد کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ علاوہ ازیں محبت بھی اداسی کی کیفیت اپنے ساتھ لاتی ہے۔ محبوب کی یاد ہنستی آنکھوں کو اداس کر جاتی ہے۔ عاشق جب محبوب

سے ملتا ہے تو اداس ہوتا ہے اور جب جدا ہوتا ہے تو بھی اداس ہوتا ہے۔ وصال کے وقت اس لیے اداس ہوتا ہے کہ اسے پتا ہے کہ ابھی جدائی کا وقت آ جائے گا۔ یہی خدشہ اسے محوِ یاس رکھتا ہے۔ عاشر اسی کیفیت کا ذکر کرتے ہیں۔

گھور اداسی بڑھتے بڑھتے اس دل کا ناسور بنی
خوشیوں کی برکھا کو چھائے کتنے موسم بیت گئے

ان کی اداسی میں اس حد تک اضافہ ہوا کہ اب یہ ناسور بن چکی ہے۔ ان کی اداسی کی ایک وجہ یادِ ماضی اور یادِ رفتگاں ہے۔

اب بھلا کوئی خوشی کیسے مجھے محسوس ہو
الجھے لمحوں کے قفس سے دل رہا ہوتا نہیں

تمہاری یاد کانوں میں کبھی جو بول جاتی ہے
تو میری ہنستی آنکھوں میں اداسی گھول جاتی ہے

۳۔ کرب:

ڈاکٹر افتخار بیگ کے نزدیک دکھ، درد، پریشانی، الم وغیرہ الفاظ کے لیے مناسب لفظ کرب ہے۔ سارتر کہتا ہے حضرت ابراہیم کو جب اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کی قربانی کا خواب آیا تو جس کیفیت میں حضرت ابراہیم مبتلا ہوئے وہ کرب تھا۔ یہ داخلی کیفیت ہے جو چہرے سے عیاں نہیں ہوتی۔ عاشر دکھنے میں خوش باش آدمی ہیں مگر ان کے اندر بڑا کرب ہے۔ دکھ، درد اور مصائب میں مبتلا ہیں۔ وہ غمِ دوراں کے ستائے ہوئے ہیں۔

کہا اس نے ہجومِ درد سے باہر کبھی آؤ
کہا میں نے مجھے اس بھیڑ میں رستہ نہیں ملتا

عاشر دکھ سہہ کر بھی ہنستے رہتے ہیں۔ وہ درد سہہ کر مسکراہٹیں بانٹنے کے فن سے خوب

واقف ہیں۔ وہ خود کرب و اضطراب کی کیفیت تو برداشت کرتے ہیں مگر کسی اور کی تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتے۔ دوسروں کے دکھ میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

مذکورہ تمام کیفیات وجودی ہیں۔ عاشر کے ہاں ان سب مسائل کا ایک ہی حل ہے اور وہ ہے محبت۔ محبت انسان کو مایوسی اور غیر یقینی حالت سے نجات دلاتی ہے۔ عاشر کو محبوب کی ذات سے اپنے ہونے کا یقین ہوتا ہے۔ محبت وسوسوں سے یقین کی سمت کا سفر ہے۔ یہ تمام داخلی و نفسیاتی پریشانیوں کا حل ہے۔

میں وسوسوں کی بھیڑ میں الجھا ہوا رہا
اور خود پہ اعتبار تجھے دیکھ کر ہوا

اکیلے پن سے ملتا ہے نہ یہ میلے سے ملتا ہے
مجھے احساس ہونے کا ترے ہونے سے ملتا ہے

عصری حسیّت اور دائرہ کار:

ادب اپنے معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ سماج میں جو حالات و واقعات رونما ہوتے ہیں، ادب ان حالات و واقعات کو نثر یا نظم کے پیرائے میں سامنے لاتا ہے۔ عصر عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب زمانہ اور عہد ہے۔ حسیت، حس سے ہے۔ ہر انسان میں پانچ حواس موجود ہیں جنہیں حواسِ خمسہ کہتے ہیں۔ ان حواس میں لامسہ، ذائقہ، سامعہ، شامہ اور باصرہ شامل ہیں۔ ان حواس کے ذریعے انسان اشیا کی حقیقت تک پہنچتا ہے۔ شعری اصطلاح میں عصری حسیت سے مراد کسی زمانے کے خارجی عوامل کا بصورتِ شعر ذکر کرنا ہے۔ عصری حسیت کا زیادہ تر تعلق عمرانیات سے ہے۔ یہ تاریخی، معاشرتی، سیاسی، تہذیبی، ثقافتی، اخلاقی، تعلیمی، معاشی ایسے موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ معاشرے کے اچھے اور برے ہر دو طرح کے پہلو اس کے مباحث ہیں۔ ''ادب معاشرے میں لکھا جاتا ہے اور اس کے مسائل کو زیرِ بحث لاتا ہے۔ مقدمہ شعر و

شاعری‘‘میں حالیؔ شاعری سوسائٹی کے تابع ہوتی ہے‘ کے تحت لکھتے ہیں

’’قاعدہ ہے کہ جس قدر سوسائٹی کے خیالات،اس کی رائیں،اس کی رغبتیں،اس کا میلان اور مذاق بدلتا ہے،اسی قدر شعر کی حالت بدلتی ہے اور یہ تبدیلی بالکل بے ارادہ معلوم ہوتی ہے ،کیونکہ سوسائٹی کی حالت کو دیکھ کر شاعر قصداً اپنا رنگ نہیں بدلتا بلکہ سوسائٹی کے ساتھ ساتھ وہ خود بخود بدلتا چلا جاتا ہے۔‘‘(۲۴)

ادیب و شاعر اپنے معاشرے سے کٹے ہوئے نہیں ہوتے۔شاعر جو کچھ دیکھتا ہے اسے تخیل کی مدد سے شعروں کا روپ دیتا ہے۔ جو معاشرے سے الگ ہو کر صرف روایتی موضوعات ہی نظم کرتے ہیں ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے بقول ایسے شاعر’’عہدِ ماضی کی یادگار ہیں۔‘‘(۲۳) شعرا دیگر لوگوں سے زیادہ حساس طبع ہوتے ہیں۔وہ دنا و مافیہا کا مشاہدہ بڑے غور سے کرتے ہیں۔مختلف تجربے ان کی شاعری کا حصہ بنتے ہیں۔ایک جینوئن ادیب اپنے معاشرے پر عمیق نگاہ رکھتا ہے اور اسے موضوعِ سخن بناتا ہے۔وہ اپنے عہد کے شعور سے متصف ہوتا ہے۔عصریت ادب میں اپنا اظہار مختلف طریقوں سے کرتی ہے۔اس میں مقامیت و آفاقیت ہر دو طرح کے پہلو موجود ہو سکتے ہیں۔اس کا اظہار ادیب اور شاعر کا کام ہے،آج کے دور میں اس کے معنی و مفہوم اور وسعت میں اضافے کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر آغا سہیل لکھتے ہیں

’’عصری آگہی کے سلسلے میں کہا جا سکتا ہے کہ اس کے مختلف دائرے معاشرے،شہر،وطن اور ایک ملک تک بھی محدود ہو سکتے ہیں۔یعنی لبنان میں فلسطینی مظلوموں پر اسرائیلی عناصر نے جنگ مسلط کر دی ہے اور فلسطینی خاک و خون میں نہا رہا ہے تو فلسطینی کا زاویۂ نگاہ اور ہوگا اور جارح اسرائیل کا مختلف گو دونوں کے آگہی کے دائرے ایک ہیں مگر زاویۂ نگاہ مختلف ہونے کے سبب ایک فلسفۂ خیر کا ترجمان ہوگا تو دوسرا شر کا

یعنی جو حیثیتیں عام ہیں ان کا تعین کرنا اور اچھے اور بُرے کی تمیز کرنا تدبیر کے ساتھ ساتھ تفکر اور تعقل کے ذریعے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علٰیحدہ کرنا بھی ضروری ہے گویا یہ محاکمہ بھی فن کار کرتا ہے تا کہ آفاقی اقدار کی بقا کا عمل جاری رہ سکے۔۔۔اس عصری آگہی کے پیچھے گزشتہ بیس سال کی سائنسی، صنعتی اور فنی ارتقا کا ایک جال بچھا ہوا ہے جس نے پوری کائنات میں پھیلی ہوئی زمین کے باشندوں کو یکجا ہونے کا احساس دلایا ہے اور بطورِ خاص تیسری دنیا کی محرومیوں کو اجاگر کیا ہے نیز استحصال کنندہ عناصر کے چہروں کو واضح کر دیا ہے۔ریڈیو، ٹیلی وژن، ٹیلی فون اور فلم کی نعمتوں کے ذریعے علوم کو تیز رفتاری سے دور دور تک پھیلایا ہے لہٰذا عصری آگہی کا وہ مفہوم جو آج سے پچاس سال قبل تھا، محدود تھا، آج زیادہ وسیع ہے۔''(۲۵)

ا۔تاریخی شعور:

عاشر کو اسلامی تاریخ پر فخر ہے، مگر وہ انیسویں، بیسویں صدی میں جو زوال مسلمانوں پر آیا اس پر خون کے آنسو روتا ہے۔اسے بہت دکھ ہوتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ وہ مسلمان جو شان و شوکت کی علامت تھے، اپنی کوتاہیوں کے سبب پستی کا شکار ہو گئے۔ عاشر عصری پیش کش میں تاریخی واقعات کو نہیں بھولتے اور اپنے قاری کو ماضی کی طرف لے جاتے ہیں۔وہ اپنے معاشرے کو تاریخی پس منظر میں پیش کرتے ہیں

کہا اس نے کہیں سے بھی خبر اچھی نہیں آتی
کہا میں نے ہمارے شہر بھی بغداد ٹھہرے ہیں

ان کے ہاں عصری صورتِ حال کی پیش کش میں مقامیت اور آفاقیت ہر دو پہلو موجود ہیں۔

''عصری آگہی کے واضح طور پر دو دوائر نظر آتے ہیں۔ایک کا تعلق اس بصیرت سے ہے جو معاشرے کی علمی سطح پر موجود ہوتی ہے اور دوسرے دائرے کا تعلق آفاق سے ہے یعنی کائنات کے باب میں تمام علوم معلومہ کی سب سے زیادہ بلند سطح کو فنکار چھو رہا ہو اور بیک وقت دونوں دائروں میں تطابق پیدا کر رہا ہو۔''(۲۶)

یہی صورت عاشر کے شعروں میں پائی جاتی ہے۔ان کی اس تکنیک میں تلمیحاتی انداز ہے۔

جو بھی چلے تھے رسمِ منصور تازہ کرنے
وہ دارِ حق پہ اکثر مصلوب ہم نے دیکھے

اس شعر سے بہت سے حق گوؤں کے واقعات ذہن میں گردش کرنے لگتے ہیں۔جہاں کہیں حق گو موجود ہیں وہاں ان کے ساتھ حکومتوں کی طرف سے ناروا سلوک ہوتا رہا ہے۔ذوالفقار احسن لکھتے ہیں''عاشر وکیل راؤ ایک بیدار اور حساس شاعر ہے جو آنکھیں بند کر کے صرف محبت کے گیت نہیں الاپتا بلکہ اس کی نظر حالات حاضرہ پر بڑی گہری ہے۔وہ کمال ہنر مندی سے بین الاقوامی مسائل کو اپنے شعروں میں کچھ اس طرح بیان کر دیتا ہے کہ پڑھنے والے حیرت اور خوشی سے اچھل پڑتے ہیں۔''(۲۷)

۲۔نئے تعلیمی نظام کے اثرات:

ہمارا تعلیمی نظام ایک طرف تو طلبہ کو دین و مذہب سے دور کر رہا ہے تو دوسری طرف ان کی صلاحیتوں کو کمزور کر رہا ہے۔ایک طویل عرصے تک مسلسل تعلیم پانے کے باوجود نوکریاں نہیں ملتیں۔جس کے نتیجے میں ڈگری ہولڈرز اس نظام سے باغی ہو جاتے ہیں۔اس عصری آشوب اور اس کے اثرات کو عاشر یوں شعری پیکر عطا کرتے ہیں۔

اس نظامِ نو سے آخر کس طرح باغی نہ ہوں
در بدر پھرتے ہیں وہ جو ڈگریوں کے بعد بھی

۳۔ناانصافی:

کہتے ہیں اگر ملک کا عدالتی نظام درست ہو جائے تو سارے ملک میں جرائم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔اسی لیے حکم بھی ہے ''اِعدِلُو'' (۲۸) عاشر اپنے ملک پاکستان میں عدل وانصاف کا نظام چاہتے ہیں۔معاشرے کی نا انصافی پر عاشر کُڑھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ پاکستان تحریکِ انصاف کے کارکن ہیں۔یہاں شریف آدمی کو سزائیں ملتی ہیں اور بڑے بڑے مجرم آزادانہ گھوم پھر رہے ہوتے ہیں۔اس کا اظہار یوں ہوا۔

بے جُرم سبھی کب سے زندان میں بیٹھے ہیں
ان اہلِ ستم کو کیوں تعزیر نہیں ملتی
وہ جس کو ہلانے سے انصاف ملے عاشرؔ
اب ایسی کہیں پر بھی زنجیر نہیں ملتی

۴۔معاشی صورتِ حال:

کسی بھی ملک (قوم) کی ترقی اور زوال کا انحصار بڑی حد تک اس کی معیشت پر ہوتا ہے۔اگر معاشی نظام درست سطح پر استوار ہے تو معاشرہ بھی ترقی کرتا ہے۔مارکس معاشرے کی بہتری کی بنیاد بہتر معاشی نظام کو قرار دیتا ہے۔وہ روپے کی برابر تقسیم کی بات کرتا ہے۔ہمارا (پاکستانی) روپیہ ۱۳۰ ڈالر اور ۳۰ ریال کے برابر ہو چکا ہے۔اسٹاک ایکسچینج نیچے آتا جا رہا ہے۔ہر فرد مقروض ہے۔ہر آنے والی حکومت مزید قرضے لیتی ہے۔ہماری قوم کے زوال کا ایک بڑا سبب معاشی نظام کی بدحالی ہے۔

کہا اس نے کہ ہم قدموں پہ اپنے کیوں نہیں چلتے
کہا میں نے کہ اب ہم خوگرِ امداد ٹھہرے ہیں

مادیت آدمی کا بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔ یہ وہی رویہ ہے جس کا اشارہ ایک حدیث میں کیا گیا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ لوگوں کا ایمان پیسہ ہوگا۔ ہمارے معاشرے میں امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ جس وجہ سے ہم دیگر اقوام سے ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

شاعر معاشرے کا نسبتاً حساس شخص ہوتا ہے۔ وہ معاشرے کی ناانصافیوں پر شعروں کے ذریعے صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ ہمارے سماج کا ایک بڑا مسئلہ غربت ہے۔ اس ملک میں ایک محتاط اندازے کے مطابق ۲۵ فیصد لوگ خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بچے سکول نہیں جا سکتے، باپ بیٹیوں کی شادی کے خرچے نہیں برداشت کر سکتے، عیدیں عام دنوں کی طرح گزر جاتی ہیں۔ لوگ ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے لیے اپنا سامان تک بیچ دیتے ہیں۔ کتنے ہی ٹیلینٹڈ (talented) افراد ایسے ہیں جو غربت کے باعث کچھ نہیں کر سکتے، جبکہ ایسے لوگ کسی بھی قوم کا روشن مستقبل ہوتے ہیں۔ عاشر کا دل اس بات پہ دُکھتا ہے۔

وہ جن ہاتھوں نے اپنے دیس کی تقدیر لکھنا ہے
غریبی ان کے ہاتھوں میں تھما کشکول دیتی ہے

ایک مفلس باپ نے بیٹی کی شادی کے لیے
چند نوٹوں کے لیے غیرت کو گروی رکھ دیا

ان بچوں کی محرومی پر غور کرو
عید کو بھی جو آدھے ننگے ہوتے ہیں

۵۔سیاسی حوالے:

ادب اور سیاست کے مابین تعلق کے بارے تھامس نے کہا تھا "In our time the destiny of man presents its meaning in political terms."

(۲۹)قبل مسیح میں افلاطون کی کتاب "Republic" اور "Law" ، سولھویں صدی میں لاک اور ہابس، اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں روسو، جان اسٹیورٹ مل اور مارکس کے ہاں سیاست ایک اہم موضوع رہا جس کے بُرے پہلوؤں پر بانگِ دہل تنقید کی گئی۔فارسی میں حافظ کی غزلیں اور اردو میں اقبال بڑے دبنگ انداز میں اس موضوع کو نظم کرتے نظر آتے ہیں۔آج کی اردو غزل میں یہ مضمون تقریباً ہر شاعر کے ہاں مل جاتا ہے۔

کہتے ہیں سیاست ملک وقوم کی فلاح کی ضامن ہوتی ہے۔سیاسی نظام کے تحت ملک چلتا ہے۔مگر جب سیاست اور دین جدا جدا ہو جائیں تو چنگیزی رہ جاتی ہے۔ہمارے ہاں سیاسی نظام اپاہج ہو چکا ہے۔جمہوریت ۔عوام کی حکوت کو کہتے ہیں مگر یہاں جمہوری حکومتوں نے جتنا ملک وملت کا نقصان کیا ہے اس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔اس نظام نے ملک کے ہر ادارے کو مفلوج کر دیا ہے۔اقبال نے ایسے نظام کو چنگیز سے تاریک تر کہا تھا۔یہاں حکمرانِ وقت قوم کے ضمیر کا سودا کرتے ہیں۔طبقاتی کشمکش ہے۔بنیادی ضروریات سے اکثر علاقے محروم ہیں۔عصمتیں اور جانیں غیر محفوظ ہیں۔خوف ودہشت کے سائے سروں پہ منڈلا رہے ہیں۔روز کے سانحوں سے سب سہمے ہوئے ہیں۔governance کہیں نظر نہیں آتی۔الغرض سیاسی نظام کلیتاً اپاہج ہو چکا ہے۔یہی موضوعات عاشر کی شاعری کا حصہ ہیں۔

امیرِ شہر کی نظروں میں سب ہی اچھا ہے
مگر یہ لٹتی رِدائیں کچھ اور کہتی ہیں

کس رستے پہ جاؤں عاشؔر
ہر رستے سے ڈر لگتا ہے

اس دور میں زندہ ہوں کہ وہ دن نہیں دیکھا جہاں
جس دن کہ شہرِ جاں میں کوئی حادثہ ہوتا نہیں

عاشر کی شاعری میں مقصدیت ہے مگران کے ہاں ترقی پسندوں کی طرح نعرے بازی نہیں ہے۔شاعری میں نعرے بازی ادبیت اور اسلوب کے حسن کو کم کرتا ہے۔عاشر کے ہاں موضوع کے ساتھ ساتھ شعر کے اسلوب میں بھی حسن وخوبی موجود رہتی ہے۔

۶۔سماجی رویے:

عاشر سماج پر عمیق نگاہ رکھتے ہیں۔جہاں سماج میں اچھے لوگ ہوتے ہیں وہیں ایسے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں جن کا رویہ ناروا ہوتا ہے۔بے رخی، بے وفائی اور بے اعتنائی ان کا شیوہ ہوتا ہے۔بعض دشمن، دوست کے لباس میں ملبوس ہوتے ہیں۔یہ آستینوں کے سانپ منافق ہوتے ہیں۔دوسروں کی خوشی انہیں برداشت نہیں ہوتی۔ان میں حسد،بغض،کینہ رکھنے والے موجود ہوتے ہیں۔ظاہری طور پر یہ بڑے تپاک سے ملتے ہیں مگر دراصل ان کے دلوں میں کھوٹ ہوتی ہے۔عاشر ایسے رویوں کو نہ صرف ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں بلکہ ان کو موضوعِ سخن بھی بناتے ہیں۔

''عاشر نے زندگی کے تلخ تجربات،معاشرے کے ناپسندیدہ رویوں اور سماجی قدروں کا جس گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ذکر کیا ہے وہ ایک طویل ریاضت کا متقاضی ہے۔''(۳۰)

عاشر لُوٹنے والوں میں تو
ایک بھی نہ تھا دشمن چہرہ

جب سے اپنے ہی عاشر مقابل ہوئے
مات پر مات کھانے پہ مجبور ہیں

گو لوگ سبھی اب تک ہنس ہنس کے ہی ملتے ہیں
لہجوں میں وہ پہلی سی تاثیر نہیں ملتی

۷۔سماجی کج رویاں:

آج معاشرے میں لایعنیت اور بے مقصدیت اپنے قدم جما رہی ہے۔انسان ایسے زندگی گزار رہا ہے کہ جیسے خدا موجود ہی نہیں ہے۔اسے کوئی فکر نہیں ہے۔انسان اپنے اصل مقصد کو بھول چکا ہے۔ہر شخص اس مقام پر براجمان ہے جس کا وہ اہل ہی نہیں۔اسی عصری آشوب کو عاشر نے یوں قلم بند کیا۔

کوئی ڈھونڈے تو کیسے کسی کو یہاں
آج کل کون ملتا ہے اپنی جگہ

اس طرح کے لوگ بھی دنیا میں دیکھے ہیں کئی
اس طرح جیتے ہیں وہ جیسے خدا ہوتا نہیں

۸۔قوم کی زبوں حالی:

عاشر اپنی قوم کی زبوں حالی پر نوحہ کناں ہے۔اس کا سبب اخلاقی اقدار کی شکست وریخت،غیرت کا مر جانا،علما کی قدر نہ کرنا اور اسلاف سے بغاوت ہے۔اس قوم پر اتنے سانحے گزرے کہ اب یہ احساس وفکر سے محروم ہوگئی ہے۔جیسے ان حالات میں جینے کی عادت پڑ گئی ہو۔

کہا اس نے ہماری یہ جہالت کیوں نہیں جاتی
کہا میں نے کہ ہم عالم کو اب عزت نہیں دیتے

اپنی خواہش کا جہنم کتنا مہنگا بھر لیا
ہم نے تو اسلاف کی جنت کو گروی رکھ دیا

کیا ہماری قوم کا احساس پتھر ہو گیا
کیوں نہیں اب چونکتی یہ سانحوں کے بعد بھی

ان مثالوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عاشر کے ہاں عصری صورتِ حال اور عصری آشوب کی بھر پور ترجمانی اور آگہی ہے۔ وہ دنیا سے منہ نہیں موڑتے بلکہ دنیا و ما فیہا سے آشنا ہونے کی جستجو میں رہتے ہیں۔ ایسے عصری آشوب کا اظہار وہی کر سکتا ہے جس کا احساس زندہ ہو اور وجدان باقی ہو، اور یہ دونوں خاصیتیں عاشر میں موجود ہیں۔

اگرچہ زندگی بھر امتحاں میں میں رہا لیکن
مرا احساس زندہ ہے مرا وجدان باقی ہے

''اس نے اپنے فن میں محبت کی روایت کو ہی آگے نہیں بڑھایا بلکہ اپنی شاعری میں عصری شعور کو بھی سمویا ہے۔''(۳۱)

''دیگر نوجوانوں کی طرح عاشر وکیل راؤ بھی محبت پر زور دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اردگرد ہونے والے واقعات کو نظر انداز نہیں کرتا۔ جہاں بھی اسے موقع ملتا ہے وہ حسبِ ضرورت انہیں اپنی نظم میں ڈھال لیتا ہے یا غزل میں شعر کی صورت میں اس کا اظہار کر دیتا ہے۔(۳۲)

مذہبی واخلاقی مضامین:

عاشر وکیل راؤ ایک سچے مسلمان ہیں۔آپ دین اسلام سے محبت کرتے ہیں۔کئی حج اور عمروں کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ان کے شعری مجموعوں میں حمد،نعت اور دعا کے علاوہ ان کی غزلوں میں کئی ایسے اشعار ہیں جن سے ان کا مذہب سے لگاؤ کا پتا چلتا ہے۔وہ اپنے محبوب سے مکالمہ کرتے ہوئے بھی مذہب کو نہیں بھولتے۔اداسی اور مایوسی کی حالت میں بھی انہیں اللہ کی ذات سے امیدِ واثق ہے۔وہ ربّ تعالیٰ کی رحمت سے نا امید نہیں ہیں۔انہیں اللہ کا سہارا کافی ہے۔

کہا اس نے کہ ہم تنہا، زمانہ ایک جانب ہے
کہا میں نے ہمیں تو بس خدا کی ذات کافی ہے

کہا اس نے خدا کو ہم بھلا کس چیز میں ڈھونڈیں
کہا میں نے بظاہر سامنے ہے، پر نہیں کُھلتا

معروف قول ہے ''جس نے خود کو پہچان لیا اس نے رب کو پہچان لیا''۔عاشر تصوف سے متعلقہ مضامین کو شعری پیکر عطا کرتے ہیں۔فنا و بقا کے تصوفانہ فلسفے کی طرف اپنے قاری کی توجہ دلاتے ہوئے اسے اس سمت راغب کرتے ہیں۔غالباً کسی ولی کا قول ہے ''موتو قبل انت موتو'' مرنے سے پہلے مر جاؤ۔جب کوئی بندہ رب کے عشق میں فنا ہو جاتا ہے تو اسے بقا نصیب ہوتی ہے۔حضرت باقی باللہ کو بھی یہ لقب مقامِ فنائیت کے بعد حاصل ہوا۔اس رتبے کو پانے کے لیے اپنا تن، من، دھن سب لُٹانا پڑتا ہے۔

اگر یہ چاہتے ہو اس سے تم منسوب ہو جاؤ
تو یہ رُتبہ بھی اپنے آپ کو کھونے سے ملتا ہے

اگر اُس تک پہنچنا ہے تو پہلے خود تلک پہنچو
خزانے کا ہمیشہ راستہ نقشے سے ملتا ہے

عہد و پیمان کی پاسداری اور وفا داری ایسی اخلاقی خوبیاں ہیں جس کا ذکر قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ارشاد ہوا:

''بے شک اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔''(۳۳)

رب نے انسان کو اپنی صفات پر پیدا کیا۔انسانوں کو چاہیے کہ اس کی صفات اختیار کریں۔وعدہ وفا کریں، بے وفائی سے گریز کریں۔سورہ الاسراء میں فرمایا:

''عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں پرسش ہو گی۔''(۳۴)

عاشر اپنے قاری کو اسی طرف راغب کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں راہِ وفا میں مشکلات ہیں لیکن ہمیشہ اسی پر استقامت سے چلتے رہنا چاہیے۔

بات تھی پاسِ وفا کی کیا بتائیں اب تمہیں
بے خطا ہو کر بھی کیوں ہم نے سزائیں اوڑھ لیں

وقت کی مصلحت بھی بجا ہے مگر
اس وفا کا تقاضا ہے اپنی جگہ

جس شخص میں شرم و حیا موجود ہے، وہ ہر چھوٹی بڑی برائی سے بچتا ہے۔ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ جس شخص میں حیا ختم ہو جائے پھر وہ جو چاہے کرتا پھرے، گویا یہ تمام بُرائیوں کی جڑ ہے۔آپ محبت میں حیا کو لازم سمجھتے ہیں۔

حیا کی کہکشاں، جیسی، ترے چہرے پہ کِھلتی ہے
یہاں ہر پھول کھلتا ہے مگر ایسا نہیں کھلتا

میں محبت میں شرطوں کا قائل نہیں
لیکن آنکھوں میں عاشر حیا شرط ہے

عاشر اجتماعی وقومی سطح پر بھی اسے موضوع بناتا ہے۔ وہ اپنی قوم کی غیرت کے مرجانے پر روتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میری قوم باحیا، باغیرت اور خوددار بنے۔ اسی میں قوم کی عظمت و رفعت ہے۔ اور جب کسی قوم کی غیرت مرجاتی ہے تو وہ زوال آشنا ہو جاتی ہے۔ پھر وہ ثریّا کی بلندیوں پر بھی ہو تو زمین کی پستیوں میں آ گرتی ہے۔

بھیک کی بیساکھیوں کے شوق میں اس قوم نے
سر جھکا ڈالا ہے اور عظمت کو گروی رکھ دیا

عاشر محنت ومشقت پر زور دیتے ہیں۔ وہ کسی شارٹ کٹ سے مقصد کے حصول کی بات نہیں کرتے۔ اپنے ہاتھ سے محنت کرنا سنت ہے اور اس کی بڑی فضیلت ہے۔ حدیثِ پاک ہے ''الکاسب حبیب اللہ'' ہاتھ سے کام کرنے والا اللہ کا دوست ہے۔ محنت میں برکت اور راحت ہے۔ ان کے نزدیک ریاضت بہ سببِ کامیابی ہے۔

کہا اس نے مسلسل کاوشیں برسوں سے جاری ہیں
کہا میں نے ریاضت بن کوئی رتبہ نہیں ملتا

مشقت کی گوارہ جو کبھی زحمت نہیں کرتا
وہ حاصل اس زمانے میں کبھی راحت نہیں کرتا
وہ کوئی حق نہیں رکھتا نصیبوں سے شکایت کا
جو سپنے تو بہت دیکھے مگر محنت نہیں کرتا

غزل کے روایتی موضوعات کو بھی عاشر نے اپنی غزل کا حصہ بنایا ہے۔ جیسے دنیا کی بے ثباتی، فنا، موت وغیرہ۔

موت ایک اٹل حقیقت ہے۔دنیا کی بے ثباتی اور موت کا مضمون اردو شاعری میں ایک روایتی مضمون ہے۔موت سے کوئی انکارنہیں کرسکتا۔قدیم وجدید شعرانے اس موضوع پر شعر کہے ہیں۔عاشرؔ بھی دنیا کو فانی سمجھتے ہیں۔وہ لفظ ''دیا'' کو جاندار کے لیے علامت کے طور پر لاتے ہیں۔اور ''کل نفس ذائقۃ الموت'' (۳۵)والی آیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

دیا بجھ گیا جو کوئی جلتے جلتے
کبھی اس کو پھر ہم نے جلتا نہ دیکھا

اب منتشر جو قتلِ خاشاک ہم ہوئے ہیں
تھی خاک سے ہی نسبت سو خاک ہم ہوئے ہیں

عاشرؔ نے تقدیر اور مسئلۂ جبر وقدر کو بھی موضوعِ شعر بنایا۔ان کے نزدیک تقدیر حق ہے اور جو لکھا ہے وہ ہر صورت ہو کر رہنا ہے۔تقدیر کے آگے تدبیر نہیں چلتی۔اور انسان مجبور ہوتا ہے۔بعض چیزوں میں انسان مختار ہے اور بعض چیزوں میں مجبورِ محض۔مثلاً مرنا سب نے ہے،اس معاملے میں انسان مجبور ہے۔البتہ اعمال حسنہ اور سیئہ میں اسے اختیار ہے،جیسے چاہے اعمال کرے۔

یوں مقدر کے ستارے گردشوں میں آ گئے
روز بازی ہارتا ہوں کھیلنے سے پیشتر

کہا اس نے مخالف سمت میں منزل نہیں ملتی
کہا میں نے مخالف سمت میں چلنا پڑا مجھ کو

عاشرؔ اپنوں سے محبت کرتے ہیں۔ہر ایک سے محبت کا سلوک اپناتے ہیں۔مگر ان کی زندگی میں سب سے اہم رشتہ ماں کا ہے۔ماں کی دعاؤں کے باعث عاشرؔ کی حیات اور رونقِ

حیات ہے۔ماں اپنے بچوں سے خالص محبت کرتی ہے۔ماں کے چہرے کی زیارت کرنا مقبول حج وعمرہ کے ثواب کے برابر ہے۔دنیا کی ہر قوم نے ماں کی عظمت کو سلام پیش کیا۔ماں اپنے بچوں کی خطائیں بھول کر ہمیشہ ان سے پیار کرتی ہے۔

یہ فقط ماں کی دعاؤں کا ہے عاشر معجزہ
جی رہا ہوں زندگی کی سازشوں کے بعد بھی

کہا اس نے کہ کعبے کا سا منظر ہو تو بتلاؤ
کہا میں نے مقدس سب سے چہرہ ماں کا ہوتا ہے
کہا اس نے ہماری سب خطائیں بھول جاتی ہیں
کہا میں نے کہ یہ بے لوث جذبہ ماں کا ہوتا ہے

عاشر کے ہاں ایک موضوع وقت ہے۔عربی میں علامہ ابنِ عربی اور انگریزی میں سٹیفن ہاکنگ نے تصورِ زمان ومکان پر خاصا کام کیا۔اردو کی قدیم وجدید شاعروں نے بھی حرکت،تغیر اور تصورِ وقت ایسے مضامین پر قلم اٹھایا۔وقت رکتا نہیں ہے اور جو وقت گزر گیا وہ پلٹ کر واپس نہیں آتا۔ماضی گزر گیا،حال،ماضی بنتا جاتا ہے اور مستقبل حال۔۔۔وقت بدلتا رہتا ہے۔کبھی اچھا وقت آتا ہے تو کبھی بُرا۔

وقت ان ہی خوابوں کو پل میں توڑ جاتا ہے
جس کو سچ بنانے میں عمر بیت جاتی ہے

حالات کی گردش نے اب رنگ بدل ڈالا
ہم سے ہی ہماری اب تصویر نہیں ملتی

عاشر وقت کی بے حسی کا ذکر تجربے کی بنیاد پر کرتے ہیں۔وہ ایک ناصحانہ طرز میں

وقت کی قدر و قیمت کا ذکر کرتے ہوئے اس کے احساس کی دعوت دیتے ہیں۔

محسوس کر کے دیکھیے لمحات کو کبھی
باتوں میں سارے لمحے گنوایا نہ کیجیے

ایسے موضوعات عاشر کے فکری زاویوں کو سامنے لاتے ہیں۔ وہ کبھی تو ایک عاشق کی صورت میں نظر آتے ہیں اور کبھی ناصح۔ کہیں وہ مختار ہیں تو کہیں مجبور۔ ان کی شاعری ان کی زندگی کی عکاس ہے، وہ شعروں میں اپنے خیالات، جذبات، خواہشات، آرزوؤں اور امنگوں کا اظہار کرتے ہیں۔ مقامیت اور آفاقیت دونوں سطحیں عاشر کی شاعری میں موجود ہیں۔ ''سماجی موضوعات پر مبنی اس کی چند غزلیں اس بات کی شاہد ہیں کہ وہ ایسے موضوعات کو نعرہ نہیں بننے دیتا بلکہ دکھ کی اس کیفیت میں ڈوب کر لکھتا ہے جو اس کی روحانی طبیعت کا خاصہ ہے۔ مجھے یقین ہے وہ کسی بھی موضوع کو اختیار کرے، وہ شعر کے نرم و نازک شریر کو زخمی نہیں ہونے دے گا۔'' (۳۶)

حوالہ جات

۱۔ خالد محمود خان، فکشن کا اسلوب، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص: ۳۴۔

۲۔ ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر، اردو غزل کا تکنیکی، ہیئتی اور عروضی سفر، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، اگست ۲۰۰۸ء، ص: ۲۷

۳۔ عاشر وکیل راؤ، مصاحبہ، سرگودھا، ۱۵ جون ۲۰۱۸ء۔

۴۔ القرآن، سورہ البقرہ، پارہ ۲، آیت: ۱۶۵۔

۵۔ محمد عبد الرحمان کمیانہ، انسائیکلو پیڈیا پیار، محبت اور عشق، دریائے محبت (حصہ اول)، فیروز سنز، لاہور،

۲۰۰۹ء، ص: ۱۰۸۔

۶۔ محمد طاہر القادری، علامہ، پروفیسر، ڈاکٹر، عرفان القرآن، منہاج القرآن پبلی کیشنز، لاہور، جنوری ۲۰۱۲ء، پارہ: ۱۱، ص: ۳۲۸، آیت: ۶۲۔

۷۔ ایضاً، پارہ: ۱۱، آیت: ۶۳۔

۸۔ سعد اللہ کلیم، ڈاکٹر، اردو غزل کی تہذیبی و فکری بنیادیں، جلد اوّل، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص: ۲۴۵

۹۔ ایضاً، ص: ۳۵۱۔

۱۰۔ ایضاً، ص: ۳۵۲۔

۱۱۔ ایضاً، جلد دوم، ص: ۵۰۱۔

۱۲۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، مترجمہ، شذراتِ فکرِ اقبال، مجلس ترقیٔ ادب، لاہور، دوم، مئی ۱۹۸۳ء دوم، ص: ۵۷۔

۱۳۔ خاور اعجاز، نئی پاکستانی اردو غزل، ابلاغ پبلیشرز، لاہور، یکم جنوری ۲۰۰۱ء، ص: ۳۰۔

۱۴۔ شفیق آصف، پروفیسر ڈاکٹر، مصاحبہ، سرگودھا، ۲۸۔ اپریل ۲۰۱۸ء۔

۱۵۔ اصغر علی اصغر، اس کے خواب سچے ہیں، مشمولہ: ترا ملنا ضروری ہے، از عاشر وکیل راؤ، وقارِ قلم پبلی کیشنز، لاہور، جنوری ۲۰۰۲ء، ص: ۲۲۔

۱۶۔ محمد عبدالرحمان کمیانہ، انسائیکلو پیڈیا پیار، محبت اور عشق، دریائے محبت، ص: ۲۵۔

۱۷۔ وصی شاہ، زرخیز زمیں کا بیٹا، مشمولہ: ترا ملنا ضروری ہے، ایضاً، ص: ۱۸۔

۱۸۔ عصری ادب میں وجودی فکر کا ارتقاء

http://nlpd.gov.pk/uakhbareurdu/october2012/oct_7.html

۱۹۔ انور سدید، ڈاکٹر، وجودیت کی تحریک، مشمولہ: ماہنامہ اوراق، لاہور، جلد: ۱۵، شمارہ: ۹، ستمبر، اکتوبر، ۱۹۸۰ء، ص ۲۵۳۔

۲۰۔ افتخار بیگ، ڈاکٹر، وجودیت: اثباتِ ذات کا فلسفہ، سٹی بک پوائیٹ، کراچی، ۲۰۱۱ء، ص: ۹

۲۱۔ جدید اردو افسانے میں وجودیت کے عناصر اردو ریسرچ جنرل۔

http://www.urdulinks.com/urj/?p=1964

۲۲۔ سرور الہدیٰ، ڈاکٹر، نئی اُردو غزل، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۱۱۔

۲۳۔ حامدی کاشمیری، ڈاکٹر، نئی غزل، ایک مطالعہ، مشمولہ: اوراق، لاہور، جلد ۲۱، شمارہ، اکتوبر، نومبر، ۱۹۸۶ء، ص: ۷۷۔

۲۴۔ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، کشمیر کتاب گھر، اردو بازار، لاہور، ص: ۲۲۔

۲۵۔ آغا سہیل، ڈاکٹر، ادب اور عصری حسیت، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۲۹۹۱ء، ص: ۳۰۔

۲۶۔ آغا سہیل، ڈاکٹر، ادب اور عصری حسیت، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص: ۲۶۔

۲۷۔ ذوالفقار احسن، جدید اردو غزل کا معمار عاشر وکیل راؤ، مشمولہ: تم ہؤنا، از: عاشر وکیل راؤ، دعا پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص: ۲۱

۲۸۔ القرآن، سورہ المائدہ، ۸۔

۲۹۔ عزیز حامد مدنی، جدید اردو شاعری، حصہ اوّل، انجمن ترقیٔ اردو، کراچی، ۲۰۰۹ء، ایڈیشن ۲، ص: ۵۷

۳۰۔ ذوالفقار احسن، جدید اردو غزل کا معمار عاشر وکیل راؤ، مشمولہ: تم ہؤنا، ایضاً۔

۳۱۔ مرزا نصیر خالد، محبت کا قتیل۔۔۔۔ عاشر وکیل، مشمولہ: ترا ملنا ضروری ہے، وقارِ قلم پبلی کیشنز، جنوری ۲۰۰۲ء، ص: ۱۴۔

۳۲۔ عطاء الرحمان تمثیل، خوشبو، مشمولہ: ترا ملنا ضروری ہے، ایضاً، ص: ۲۴۔

۳۳۔ القران، سورۂ آل عمران، ۹۹۔

۳۴۔ القران، سورہ الاسراء، ۱۷۔

۳۵۔ القرآن۔ سورہ آل عمران۔

۳۶۔ ریاض احمد شاد، عاشر وکیل راؤ۔۔ ایک پختہ شاعر، مشمولہ: ترا ملنا ضروری ہے، ایضاً، ص: ۲۰۔

باب سوم

عاشر کی غزل کا فنی جائزہ

اردو شاعری کو عام طور پر پرکھنے کے لیے دو پیمانے وضع کیے گئے ہیں۔ایک ہے فن دوسرا فکر۔فن شاعری کا ظاہر ہے اور فکر باطن۔فن کے لیے ماہرینِ شعر نے کئی پیمانے ترتیب دیئے ہیں اور فکر جو باطن ہے وہ شعر کے موضوع اور مضامین وغیرہ پر بحث کرتا ہے، جو کہ پچھلے باب میں ہو چکا۔فن کے لیے ایک لفظ اسلوب بھی مستعمل ہے۔انگریزی میں اسے style کہتے ہیں۔ادب میں اسلوب کسی نثّار یا شاعر کے اس طرزِ تحریر کو کہتے ہیں،جس میں اس کی فنی خصوصیات کا اظہار ہوتا ہے۔اسے دماغ کی خارجی صورت اور شخصیت کا اظہار بھی کہا گیا ہے۔پروفیسر محمد حسن اسلوب کی جامع تعریف یوں کرتے ہیں

> ''اسلوب وہ قوتِ اظہار ہے جس میں صدیوں کی تہذیب بولتی ہے۔اسلوب وقت کا بھی ہوتا ہے، زبان کا بھی، صنف کا بھی اور مصنف کا بھی۔وہ گواہی دیتا ہے کہ زبان کی روایت میں نمو کی قوت کتنی ہے۔اور اس کے اظہار اور فروغ میں کونسی توانائیاں کارفرما ہیں۔ہر اُسلوب محض صاحبِ اسلوب کی وراثت اور ذہانت ہی کی گواہی نہیں دیتا بلکہ کسی زبان و ادب کے چھُپے ہوئے خزانوں کا سراغ بھی دیتا ہے اور ہر قسم کی دولت کو آفتاب عالم تاب کی طرح چمکا کر ازسرِ نو دولتِ بیداد کا مرتبہ دیتا ہے۔''(۱)

شمیم حنفی نے اسلوب کو اس حد تک اہمیت دی کہ ''مافیہ یا مواد فی نفسہ کسی فن پارے کی قیمت میں اضافے کا سبب نہیں بنتا۔اصل چیز اس مواد کی فنی تعبیر ہے۔''(۲)

عاشر وکیل راؤ کے شعر کو فن کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے ماہرین کے مقررہ پیمانوں کو استعمال کرتے ہوئے دیکھا جائے گا کہ وہ کس حد تک ان پیمانوں پر پورا اترتے ہیں۔

عاشر کے ہاں ہمیں اصناف کی گہرائیوں میں نہیں جانا پڑتا۔اس نے زیادہ تر غزل کہی ہے۔حمد،نعت،فردیات اور قطعات عموماً غزل کی ہیئت میں ہیں۔یہاں صرف عاشر کی غزل کے فن پر بحث کی گئی ہے۔عاشر وکیل راؤ نے غزل میں چند بحروں سے ہی استفادہ کیا ہے لیکن طویل اور مختصر بحروں سے غزل کو سنوارنے کی پوری کوشش کی ہے۔مختصر اور طویل بحر دونوں میں شعر کہنا خاصا مشکل ہے۔عاشر کے ہاں جس بحر میں سب سے زیادہ غزلیں ملتی ہیں وہ بحر''بحرِ ہزج''ہے۔یہ بحر مفاعیلن کے رکن پر ہے۔مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

بحرِ ہزج مثمن سالم: مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

عاشر کی بہت سی غیر مکالماتی اور تمام مکالماتی غزلیں (تیسرے مجموعے کی غزلیں) اسی بحر میں ہیں۔آپ نے زیادہ غزلیں بحرِ ہزج مثمن سالم میں کہیں۔

بہت خاموش رہ کر جو صدائیں مجھ کو دیتا تھا
بڑے سندر سے جذبوں کی قبائیں مجھ کو دیتا تھا

ہمارے سب ارادوں کی نئی تشکیل کر ڈالے
نجانے وقت کس کو کس قدر تبدیل کر ڈالے

کہا اس نے تمہاری اس قدر کیوں لال ہیں آنکھیں
کہا میں نے متاعِ غم سے مالا مال ہیں آنکھیں
وہ کہتی ہے مری نظروں سے تم اوجھل نہ ہو جانا
میں کہتا ہوں یہی تم سوچ کے پاگل نہ ہو جانا

بحرِ ہزج کے علاوہ بحرِ رمل میں آپ نے بہت سی غزلیں کہیں۔بحرِ رمل کا بنیادی رکن فاعلاتن ہے۔

بحرِ رمل،ث،م سالم: فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن

عاشر کے ہاں بحرِ رمل میں مثمن محذوف کی بحر سے زیادہ استفادہ ہوا ہے۔

حوصلہ کرتے ہیں جینے کا مگر ہوتا نہیں
زندگی کا یہ سفر کیوں مختصر ہوتا نہیں

عکس اس کی آنکھ میں اُبھرا مری تصویر کا
اک وہی لمحہ تو حاصل تھا مری تقدیر کا

جب تلک کے ٹھوکروں سے رابطہ ہوتا نہیں
زندگی سے اُس گھڑی تک آشنا ہوتا نہیں

مختصر بحر اور طویل بحر دونوں میں شعر کہنا مشکل ہے۔کئی بار طویل بحر کے شعر میں کی گئی بات شعر کے تمام ارکان سے پہلے مکمل ہو جاتی ہے مگر شعر کے دونوں مصرعوں کو ایک دوسرے کے برابر کرنا،رعایتِ لفظی،مناسب الفاظ کا انتخاب ایک مشقت طلب کام ہے۔اور مختصر بحر میں غزل کہنے کے لیے فن پر دسترس ہونا بہت ضروری ہے۔ایسے الفاظ کا چناؤ جن سے بات بھی مکمل ہو جائے اور وزن میں جھول بھی نہ ہو،بہت ریاضت چاہتا ہے۔عاشر نے طویل اور مختصر بحور کی غزلوں پر خاصی محنت کی ہے۔''چھوٹی بحر میں کہے ہوئے اس کے شعر اس کے فن کی پختگی کی گواہی دینے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔''(۳)

بچھڑ کے بھی تم نے مجھ سے جاناں نہ چین پایا تو کیا کرو گے
جو میری یادوں نے آگ بن کر یہ دل جلایا تو کیا کرو گے

مسیحا دیکھو ابھی نہ جاؤ کہ دو گھڑی کی ہے جان باقی
جو ہو سکے معجزہ دکھاؤ کہ دو گھڑی کی ہے جان باقی

مختصر بحروں کی غزلوں کی مثالیں ملاحظہ کیجیے:

وفا رسوا نہیں کرنا
کبھی ایسا نہیں کرنا

سچی باتیں کرتے ہو
کیسی باتیں کرتے ہو

عاشر سادہ گو ہیں بلکہ انتہائی سادہ گو ہیں۔ان کے شعروں میں ابہام نام کو نہیں مگر ایمائیت کے حامل اشعار موجود ہیں۔''عاشر وکیل راؤ نہایت سادہ اور شستہ زبان میں نہایت دلنشین شعر کہنے والا شاعر ہے۔''(۴) سلاستِ شعری نے روانیٔ شعر کو برقرار رکھا ہوا ہے۔بعض ناقدین کا خیال ہے کہ سلاست اور روانی آمد کے شعروں میں بخوبی پائی جاتی ہے۔ایسے شعروں پر زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی بلکہ پورا پورا مصرع یا شعر ذہن میں آ جاتا ہے۔اس لیے ایسے اشعار آسان ہوتے ہیں۔شعروں میں منطقی ربط موجود ہے۔ جملے کی ترتیب نہیں توڑتے۔کبھی کبھی دونوں مصرعے ایک ہی جملے پر مشتمل ہوتے ہیں۔عاشر کے اشعار ایجاز و بلاغت کا حسین امتزاج دکھائی دیتے ہیں،جس سے ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

قسمت تو پھر آخر قسمت ہوتی ہے
سپنے تو پھر آخر سپنے ہوتے ہیں

میں پہلے ہی اکیلا ہوں
مجھے تنہا نہیں کرنا

عاشر کی غیر معمولی سادگی کبھی کبھار غزل کی ایمائیت کو مجروح کر دیتی ہے۔ایک ہی نوع

کے الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔محبت،آنکھیں،خواب، سپنے،موسم،بارش ان کے ہاں کلیدی الفاظ ہیں۔ان کا طرزِشعر رومانی ہے اور ایسے الفاظ رومانوی جذبات واحساسات کے اظہار کے لیے بہت ممد ہیں۔عاشر نے یہ الفاظ بہت سی غزلوں میں استعمال کیے ہیں۔کبھی شعر کے آغاز میں،کبھی وسط میں،کبھی بطور قافیہ اور کبھی ردیف کے طور پر۔

کس قدر انوکھا ہے ضابطہ محبت کا
کب نجانے ہو جائے معجزہ محبت کا

آنکھوں کو ساون برسائے کتنے موسم بیت گئے
تم کو میرے سامنے آئے کتنے موسم بیت گئے

دل اُداس کر ڈالا تیرے بعد بارش نے
غم شناس کر ڈالا تیرے بعد بارش نے

عاشر کے بعض اشعار میں بھرتی کے الفاظ ہیں۔جب کوئی مناسب لفظ ذہن میں نہ آرہا ہو اور مصرعے کے وزن میں کسی رکن کی کمی ہو تو عاشر بھرتی کے الفاظ سے اس کمی کو پورا کرتے ہیں۔اگرچہ ایسے اشعار جن میں بھرتی کے الفاظ ہوں،ان پر محنت کرنے سے اشعار مزید بہتر ہو سکتے ہیں۔بھرتی کے الفاظ کی جگہ مناسب الفاظ شعر میں آسکتے ہیں یا پھر کم از کم بھرتی کے الفاظ میں کمی واقع ہوسکتی ہے۔

بہت دنوں سے کوئی سانحہ نہیں گزرا
بہت دنوں سے یہ حیران ہیں مری آنکھیں

کہ جس اسمِ اعظم کی خواہش تھی دل کو
تری آنکھ سے وہ عبارت ملی ہے

پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں لفظ ''یہ'' اور دوسرے شعر کا پہلا لفظ ''کہ'' بھرتی کے الفاظ ہیں۔عام بول چال کے الفاظ کا برتاؤ ان کی شاعری کی خوبی ہے۔علاوہ ازیں وہ شعروں میں ہندی الفاظ کا استعمال بھی کرتے ہیں۔مگر ان کے شعروں میں ہندی زبان کے مشکل الفاظ نہیں بلکہ ایسے الفاظ ہیں جن کے معانی ہر عام آدمی جانتا ہے۔ہندی الفاظ کی کثرت دکنی شاعری میں تھی۔پھر رفتہ رفتہ ہندی لفظ کم ہوتے چلے گئے مگر آج بھی اردو غزل گو ایسے الفاظ غزل میں شامل کرتے ہیں۔ڈاکٹر سرور الہدیٰ اس لسانی تجربے کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں:

> ''نئی غزل میں ایک نیا رجحان ہندی الفاظ، تلمیحات اور ہندی تراکیب کے استعمال کا سامنے آیا ہے۔ہندی کے اثرات کسی نہ کسی شکل میں ہر دور میں قائم رہے۔دکن کی شاعری پر بھاشا کی شاعری کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔دکنی شعرا نے مقامی عناصر پر بہت زور دیا۔ولی کے آخری دور کے کلام پر فارسی کا اثر زیادہ ہے۔مگر اس کے باوجود ولی کے ہاں ہندی الفاظ تلاش کیے جا سکتے ہیں۔غزل کے لیے ہندی الفاظ کا استعمال کوئی نئی بات نہیں ہے مگر ایک عرصے کے بعد غزل کی زبان میں ہندی الفاظ و علامیے کا عمل دخل کچھ اس طرح ہوا کہ اس نے ایک تجربہ کی شکل اختیار کر لی۔''(۵)

سوچ رہا ہوں آج میں عاشر تنہائی کے زنداں میں
میری پوجا کرتا تھا جو وہ کیسے بھگوان ہوا

ہم نے سوچا تھا کیا پر یہ کیا ہو گیا، بخت جاگا ہوا جانے کیوں سو گیا
دیپ یادوں کے اب نہ جلانا سجن، نہ ہی خوابوں کے آنگن میں آنا سجن

ان اشعار میں پوجا، بھگوان، دیپ، سجن اور آنگن ہندی زبان کے الفاظ ہیں مگر یہاں

یہ الفاظ غیر مانوس محسوس نہیں ہوتے۔

عاشر شعروں پر محنت کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ ''میں ممکنہ حد تک شعروں کی نوک پلک سنوارتا ہوں''(٦)۔شعروں میں تراکیب کا استعمال بھی بخوبی کیا ہے۔ترکیب دو یا دو سے زیادہ الفاظ کے ملانے سے بنتی ہے۔اس کی مختلف صورتیں ہیں۔عاشر کی شاعری میں ترکیبِ اضافی موجود ہے۔ترکیبِ اضافی میں پہلے لفظ کے نیچے زیر لگا کر اسے دوسرے لفظ کے ساتھ ملایا جاتا ہے۔جیسے برگِ آوارہ،قدرِ مشترک وغیرہ۔تراکیب کا استعمال کلام میں اختصار، جامعیت، بلاغت، زورِ بیان اور حسن پیدا کرتا ہے۔وہ پیچیدہ تراکیب کا استعمال نہیں کرتے۔ایسی تراکیب لاتے ہیں جن سے شعر کی روانی میں فرق نہیں پڑتا اور عام قاری انہیں آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔

سبھی خواہشیں حسرتوں میں ڈھلی ہیں
کہ زخمِ تمنا ہرا ہو گیا ہے

غمِ دوراں نے مجھ کو آزمایا بارہا لیکن
مرے ہونٹوں پہ اب تک بھی وہی مسکان باقی ہے

کہا میں نے کہ پلکیں ہر گھڑی پُرنم ہی رہتی ہیں
کہا اس نے کہ بحرِ غم کی طغیانی نہیں جاتی

عاشر نے نہ صرف روایتی تراکیب کو شعروں میں برتا بلکہ بعض نئی تراکیب بھی ایجاد کیں۔مثلاً ''جانِ حیا''،''جانِ عاشر'' وغیرہ۔

امر مجھ کو تم نے کیا جانِ عاشر
تمہی سے وفاؤں کو عظمت ملی ہے

عاشر شاعری میں ترکیبِ توصیفی سے بھی کام لیتے ہیں۔ترکیبِ توصیفی ایسے الفاظ کے مجموعے کو کہتے ہیں جس میں ایک صفت اور دوسرا موصوف ہو۔

یہ گہرے راز ہیں دل کے کسی کا کیا بھروسہ ہے
ذرا سی بات کی یونہی کوئی تفصیل کر ڈالے

اگر صحرائے وحشت کی مسافت ہی مقدر تھی
تو ان آنکھوں کے کوزوں میں کوئی دریا تو رکھنا تھا

عاشر غزل میں مطلع کو لازم سمجھتے ہیں۔ان کی بعض غزلوں میں دو دو مطلعے ہیں۔اچھا مطلع کہنا بڑی ریاضت کا کام ہے۔مطلعِ ثانی سے عاشر کی مہارتِ تامہ کا علم ہوتا ہے۔ان کے مطلعِ ثانی،مطلعِ اوّل کے موضوع کی توضیح کرتے ہیں۔

بے سبب ہی کرتے ہو اب گلہ اجڑنے کا
خود ہی کر لیا تم نے فیصلہ اجڑنے کا
روز دیکھتا ہوں میں واقعہ اجڑنے کا
جانے کب سے جاری ہے سلسلہ اجڑنے کا

آپ اپنی ذات کو زیر و زبر کرنا پڑا
کام مشکل تھا بہت مجھ کو مگر کرنا پڑا
آبلوں سے بھی مجھے صرفِ نظر کرنا پڑا
ایک خواہش کا تعاقب عمر بھر کرنا پڑا

قافیہ غزل کی شرط ہے۔اس کے بغیر اگرچہ غزلیں لکھی گئیں مگر ان غزلوں کو پذیرائی نہیں مل سکی،کیونکہ شاعروں کا خیال ہے کہ قافیہ کا غزل میں لانا بہر حال ضروری ہے۔عاشر نے قافیوں پر

خاصی محنت کی ہے۔اس کے شعروں میں آسان قافیوں کے ساتھ ساتھ مشکل،منفرد اور نایاب قافیے بھی ہیں۔مشکل قافیوں کو نبھانا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ان پر بڑی محنت لگتی ہے۔کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ نایاب قافیے نبھانا اتنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان قافیوں کی وجہ سے کئی غزلیں ادھوری رہ جاتی ہیں مگر عاشر نے ایسے قافیوں کو خوب نبھایا ہے جس پر اس کا قاری اسے داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

جس طرح مینار کوئی منہدم ہونے کے بعد
منتشر میں ہو گیا ہوں منقسم ہونے کے بعد

جس کا لہجہ شہد کی صورت صدا میٹھا رہا
کتنا زہریلا ہوا ہے منتقم ہونے کے بعد

عاشر نے نئے اور پیچیدہ قافیوں کے ساتھ ساتھ ضمنی قافیوں کے تجربے بھی کیے۔ضمنی قافیے ،اصل قافیوں کے علاوہ ایسے قافیے ہوتے ہیں جن سے غزل میں تغزل اور حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔

ہم نے سوچا تھا کیا پر یہ کیا ہو گیا، بخت جاگا ہوا جانے کیوں سو گیا
دیپ یادوں کے اب نہ جلانا سجن، نہ ہی خوابوں کے آنگن میں آنا سجن

بن ترے ہم جئیں تو جئیں کس طرح، ہجر کا سم پئیں تو پئیں کس طرح
اس طرح تو ہمیں آزما نہ سجن، ہو سکے تو ہمیں بھول جانا سجن

عاشر نے صوتی قافیوں کو بھی اپنی غزل میں جگہ دی۔صوتی قافیوں کو ہم آواز قافیے بھی کہتے ہیں۔اس سے مراد شعر میں ایسے قافیے لانا ہیں جو ہیئت میں تو مختلف ہوں مگر ان کی آواز ایک سی ہو مثلاً 'ق' اور 'ک' اسی طرح 'ا'، 'ح' اور 'ہ' وغیرہ۔عاشر صوتی قافیوں کو نہ صرف جائز سمجھتے ہیں بلکہ ان کو شعروں کی زینت بھی بناتے ہیں۔

اب منتشر جو مثلِ خاشاک ہم ہوئے ہیں
تھی خاک سے ہی نسبت سو خاک ہم ہوئے ہیں
جتنا گریز ہم سے وہ آنکھ کر رہی ہے
اُتنا ہی دید کے پھر مشتاق ہم ہوئے ہیں

جبینِ وقت پہ لکھا ہوا اک مرثیہ ہوں میں
جو پوری ہو نہیں سکتی کبھی ایسی دعا ہوں میں

پہلے دو شعروں میں خاک اور مشتاق اور دوسرے شعر میں مرثیہ اور دعا صوتی قافیے ہیں۔ ردیف غزل کے لیے لازم نہیں البتہ شعراء اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ غزل میں حسن، تغزل اور موسیقیت کے اضافے کا باعث ہے۔ عاشر نے مختصر ردیفوں کے علاوہ طویل ردیفوں کا اہتمام بھی کیا ہے جو اس کی غزل کے تاثر کو بڑھاتی ہیں۔ طویل ردیفوں سے موسیقیت پیدا ہوتی ہے اور اگر صوتی پہلو سے ان ردیفوں کا جائزہ لیں تو ان میں صوتی خوبصورتی ملتی ہے جو سامعین کے گوش گزار ہوتے ہی ان کو محظوظ کرتی چلی جاتی ہے۔ ان کی ردیفیں رومانی طرز کی ہیں۔

تمہارے پاس آتا ہوں تو دل میں پھول کھلتے ہیں
تمہارا لمس پاتا ہوں تو دل میں پھول کھلتے ہیں

عذاب ہجر ہوا، ہو سکے تو لوٹ آؤ
تڑپ رہی ہے وفا، ہو سکے تو لوٹ آؤ

خوشی کے آنچل میں لپٹے ہر پل وفاؤں کی دسترس میں تھے ہم
کسی کے دل کا قرار بن کر دعاؤں کی دسترس میں تھے ہم

محاورہ زبان کی چاشنی اور تہذیب کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ دو یا دو سے زائد الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے جو مجازی معنی رکھتا ہے۔ شعر میں محاورہ لانا بڑے فن کا کام ہے۔ عاشر نے 'خود کو کھونا'، 'دل بھر آنا'، 'جان میں جان آنا' محاوروں کو برتا ہے۔ ''جان میں جان آنا'' کا محاوہ اپنے بیان کے موزوں ترین اظہار یے کے لیے چنا ہے؛ جو شعر کی چکاچوند اور عاشق کے صداقت پر مبنی جذبے کا مکمل غماز ہے۔''(۷)

کہا اس نے بھلا مجھ میں تمھیں کیا چیز بھاتی ہے
کہا میں نے تمھیں دیکھوں تو جاں میں جان آتی ہے

دل جب غم سے بھر آتا ہے
یاد وہ چارہ گر آتا ہے

غزل نے قصیدے کی شکم سے جنم لیا۔ قصیدے میں بادشاہِ وقت کی تعریف ہوتی تھی اور غزل میں بادشاہِ حسن کی تعریف ہوتی ہے۔ عام طور پر ہر شاعر نے محبوب کی تعریف کی ہے۔ محبوب کی چشم و زلف و رخسار کی مدح کے موتی شعروں میں پروئے ہیں۔ عاشر نے بھی محبوب کی سراپا نگاری کی ہے۔ سراپا نگاری سے مراد محبوب کے جسمانی اعضا کا اس خوبصورتی سے ذکر کرنا ہے کہ اس میں کوئی عیب نظر نہ آئے اور ان اعضا کی نفاست و لطافت ظاہر ہو۔ عاشر نے اس فن سے محبوب کا سراپا تراشا ہے کہ اس میں حسن پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے شعروں میں کہیں ابتذال نہیں ہے۔ وہ محبوب کی سراپا نگاری کے لیے تشبیہاتی انداز اختیار کرتا ہے۔

کہا میں نے کہ یہ آنکھیں تمہاری خوبصورت ہیں
کہا اس نے سبب اس کا تمہارا پیار ہی تو ہے

بظاہر تو بہت ہی دور تم سے آ گئے لیکن
تمہارے مرمریں بازو سے اب تک ہم نہیں نکلے

تمہاری آنکھ میں اب تک وہی اک شام ٹھہری ہے
تمہارے سرمئی گیسو سے اب تک ہم نہیں نکلے

عاشر تضمین کے فن سے خوب واقف ہے۔تضمین کے لغوی معنی ''ساتھ لگانا اور شامل کرنا''(۸) کے ہیں۔اصطلاح میں تضمین کسی شاعر کے مصرعے پر مصرع لگانا ہے۔اس کی ایک صورت طرح مصرع کی ہے۔بعض شعری مقابلوں اور مشاعروں میں ایک طرح مصرع دیا جاتا ہے جس پر غزل لکھنا ہوتی ہے۔

میرؔ، غالبؔ، سوداؔ، اقبالؔ ایسے بڑے شاعروں نے کئی غزلوں پر تضمینیں لگائیں۔عاشر نے بڑی مہارت سے اس فن کا استعمال کیا اور پختہ تضمینیں کہیں۔ان کی تضمینیں مطلعاتی ہیں۔مطلعاتی طرز کی تضمین کہنا قدرِ مشکل ہوتا ہے۔یہ تضمینیں ان کے پہلے شعری مجموعے ''ابھی امکان باقی ہے'' کی غزلوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔وہ کہتے ہیں'' کالج لائف میں جب کبھی مقابلوں کے لیے طرح مصرعے نوٹس بورڈ پر آویزاں کیے جاتے تو میں بھی ان مصرعوں پر غزل کہتا''(۹)۔ان کی تضمینیں جاندار ہیں۔

اس برس طوفان نے آ کر کیا کچھ بھی نہیں
''جان لیوا خوف تھا لیکن ہوا کچھ بھی نہیں''

''ہمارے دل کی دعائیں کچھ اور کہتی ہیں''
مگر سمے کی ادائیں کچھ اور کہتی ہیں

غنائی شاعری میں خیال کے ساتھ ساتھ وزن اور لے بڑی اہم ہوتی ہیں۔ناصر کاظمی نے موسیقی اور مصوری کو شاعری کی آنکھیں کہا تھا۔عاشر کے شعروں میں الفاظ کے برمحل استعمال ،ترتیب،نشست،قافیے ردیف،اندرونی قوافی،تکرارِلفظی اور اصوات کے دھیمے پن سے غنائیت اور موسیقیت پیدا ہوگئی ہے۔انگریزی میں اسے Lyric poetry کہتے ہیں۔ایسی غزلیں

گانے کے قابل ہیں۔

مری ذات میں خلا تھا تجھے دیکھنے سے پہلے
میں تو خود سے بھی جدا تھا تجھے دیکھنے سے پہلے

نگاہوں کا حسیں درپن تمہارے نام کرتا ہوں
میں ہر اک سانس ہر دھڑکن تمہارے نام کرتا ہوں

ہمارے شعروں میں کیوں ہے ماتم کوئی تو سمجھے کوئی تو جانے
نصیب ہم سے رہا ہے برہم کوئی تو سمجھے کوئی تو جانے

اسد اعوان عاشر کی شاعری کے فن کو یوں سراہتے ہیں ''جدید لب و لہجہ، دلفریب استعارات، چونکا دینے والے الفاظ کا استعمال، نئی بحریں، منفرد ردیف وقافیہ طرح طرح کے نت نئے تجربات یہ تمام آج کی جدید اردو شاعری میں بکھرے ہوئے رنگ ہیں۔ جن کو متشکل اور مجسم کر دیا جائے تو جو تصویر بنے گی عاشر وکیل راؤ کی ہوگی۔''(۱۰)

عاشر کی شاعری کا مطالعہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ اس نے بہت سی صنعتوں سے استفادہ کیا ہے۔ان میں بیان اور بدیع کی صنعتیں شامل ہیں۔ان صنائع بدائع نے اس کی شاعری کو مزید نکھارا ہے۔

عاشر نے صنعتِ تشبیہ کا استعمال بڑی مہارت سے کیا ہے۔تشبیہ، شبہ سے ہے جس کے معنی ''مماثل ہونا''(۱۱) ہے۔علمِ بیان کی اصطلاح میں تشبیہ کسی ایک شے کو مشترک خصوصیت کی بنا پر کسی دوسری شے جیسا قرار دینا ہے۔ عاشر کے ہاں تشبیہِ مُرسَل اور تشبیہِ مؤکّد دونوں صورتیں ہیں۔تشبیہِ مرسل میں حرفِ تشبیہ مذکور ہوتا ہے جبکہ تشبیہِ مؤکد میں حرفِ تشبیہ مذکور نہیں ہوتا۔تشبیہِ مرسل کی مثال دیکھیے

کہا اس نے محبت خوبصورت پھول جیسی ہے
کہا میں نے کہ اس گل کی معطر باس تم ہو نا

تشبیہِ مؤکد کی مثال ملاحظہ کیجیے:

مری ان جھیل آنکھوں کو
کبھی صحرا نہیں کرنا

عاشر کے اکثر تشبیہاتی شعروں میں حسن باصرہ سے متعلق مشبہ بہ ہیں۔اس کے ہاں مفرد اور مرکب دونوں قسم کی تشبیہات موجود ہیں۔وہ تشبیہِ بعید کے بجائے تشبیہِ قریب اور تشبیہِ مفصل سے استفادہ کرتا ہے۔

ہجر کی شب سے کالی زلفیں
وصل کے دن سا روشن چاند

گم تمہاری جستجو میں حد سے بڑھ کر ہو گئے
رفتہ رفتہ ڈوبتے سورج کا منظر ہو گئے

کہا اس نے کہ ان میں آس کے جگنو چمکتے ہیں
کہا میں نے کہ جیسے نور کے دو تھال ہیں آنکھیں

تشبیہاتی اشعار سے اس کی جمالیاتی حس کی بھی جانکاری ملتی ہے۔شاعری میں صنعتِ تشبیہ سے زیادہ مشکل صنعتِ استعارہ کا استعمال ہے۔استعارہ کے لغوی معنی عاریتاً طلب کرنے کے ہیں۔اصطلاح میں کسی مشترک خصوصیت کی بنا پر ایک چیز کو ہو بہو دوسری چیز کہنا استعارہ ہے۔البتہ ان دو اشیا میں تشبیہ کا تعلق ہوتا ہے۔شیر کہہ کر بہادر مراد لینا، چاند کہہ کر بیٹا مراد لینا وغیرہ۔مستعار لہ، مستعار منہ اور وجہِ جامع ارکانِ استعارہ ہیں۔شعر میں استعارہ لانے کے لیے گہرا مشاہدہ اور قوتِ تخیل درکار ہوتی ہے۔غالب کا شعر ہے

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

گویا مشاہدۂ حق کی گفتگو بادہ و ساغر کے پردے میں بیان کرنا استعارہ ہے۔ استعارے میں لغوی معنی کے بجائے مجازی معنی مراد ہوتے ہیں۔ عاشر کی غزلوں میں استعاروں کی مثالیں نہایت محدود ہیں البتہ بعض اشعار میں روایتی استعارے ہیں۔

کیوں مجھ کو تکتے رہتے ہو
اک دن مجھ سے بولا چاند

کوشش کے باوجود کہاں مل سکی مجھے
میں زندگی کے ساتھ تو اوقات بھر گیا

عاشر نے صنعتِ تلمیح کا بڑا فنکارانہ استعمال کیا ہے۔ تلمیح کے لغوی معنی اشارہ کرنا کے ہیں۔ علمِ بدیع کی اصطلاح میں ''شاعر کا اپنے کلام یا نثر نگار کا اپنی نثر میں کسی مشہور واقعے یا مسئلے، روایت، قصے، شخص، چیز، جگہ، حدیث، قرآنی آیت یا کسی فنی اصطلاح کی طرف اشارہ کرنا ''تلمیح'' کہلاتا ہے۔'' (۱۲) تلمیح کوئی لفظ، ترکیب یا ایسی اصطلاح ہوتی ہے جس سے پورا واقعہ ذہن میں آجائے۔ عاشر کی غزل میں اکثر تلمیحات ترکیبِ اضافی سے تشکیل پاتی ہیں۔ وہ اسلامی تاریخی تلمیحات کو شاعری کا حصہ بناتے ہیں۔ ایسی تلمیحات سے عصری حس کا اظہار ہوتا ہے۔

وہ ظلم، رہے جس میں ہر دور میں شرمندہ
اس دور میں وہ رسمِ شبیر نہیں ملتی

مجھے عہدِ رواں کی اس روش سے خوف آتا ہے
کہ جو ہابیل ہے، اس کو نہ یہ قابیل کر ڈالے

جو بھی چلے تھے رسمِ منصور تازہ کرنے
وہ دارِ حق پہ اکثر مصلوب ہم نے دیکھے

'رسمِ شبیر'،'ہابیل'،'قابیل'،'رسمِ منصور' تلمیحات ہیں۔'رسمِ شبیر' سے امام کا واقعہ کربلا،'ہابیل قابیل' سے ان کا اپنی حسین بہن کے لیے لڑنا جھگڑنا اور قابیل کے ہاتھوں ہابیل کا قتل،'رسمِ منصور' سے منصور حلاج کا انا الحق کا نعرہ اور اس کی پھانسی کا واقعہ ذہن میں گردش کرنے لگتا ہے۔

عاشر کی قوتِ تخیل کا اندازہ ان کے ایسے اشعار سے ہوتا ہے جن میں الفاظ کے ذریعے مختلف تصویریں بنائی گئی ہیں۔اسے تمثال آفرینی کہتے ہیں۔تمثال آفرینی کے لیے شعری پیکر، شاعرانہ مصوری اور لفظی تصویری کے الفاظ بھی مستعمل ہیں۔انگریزی میں تمثال آفرینی کے لیے متبادل لفظ Imagery ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر تمثال آفرینی کی تعریف یوں کرتے ہیں:

> ''جب شاعر مناسب ترین الفاظ کی مدد سے کسی شخص، شے، منظر یا وقوعہ کی ایک درست تصویر کشی کرے کہ اس شخص، شے، منظر یا وقوعہ کی آنکھوں کے سامنے تصویر کھچ جائے تو اسے امیجری کہتے ہیں۔''(۱۳)

اکثر ناقدین کے مطابق تمثال ایک ایسا لفظ یا ترکیب ہوتی ہے جس سے ایک حسّی خیال کا ادراک جنم لے۔تمثال سے ملتا جلتا ایک لفظ تمثیل ہے۔یاد رہے کہ ان دونوں لفظوں میں فرق ہے۔تمثیل کی اصطلاح ڈرامے کے لیے مستعمل ہے جس میں باقاعدہ ایک کہانی ہوتی ہے جبکہ تمثال کسی خیال کا نقش ہے۔یہ جذبہ اور احساس بھی ہوسکتا ہے۔علاوہ ازیں تمثیل کی جمع تمثیلات اور تمثال کی جمع تماثیل ہے۔عاشر کے ہاں تمثال نگاری کی عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ایسی مثالیں جن سے ان کی قوتِ متخیلہ کا پتا چلتا ہے۔تخیل دراصل ''تمثال ہائے خیالی پیدا کرتا ہے اور بات کرنے کا وہ ڈھنگ وجود میں لاتا ہے جس سے صورت شعر کے مقام بلند تک پہنچتی ہے۔''(۱۴)

ساحلوں سے ماورا ہے یہ سمندر عشق کا
سوچنا تھا ناؤ دل کی ڈالنے سے پیشتر

نہ عشق کا سمندر ہوتا ہے اور نہ دل کی ناؤ لیکن اس طرزِ بیان سے سمندر اور اس کے ساحل کے منظر کا ایک عکس ذہن میں ضرور بن جاتا ہے۔ عاشر کے ہاں بصری تمثال کے شعری نمونے ہیں جو قارئین کی حسّ باصرہ کو فعال کرتے ہیں۔

اگر احساس کے آنگن میں عاشر حبس بڑھ جائے
بہاریں چار سُو ہوں بھی تو گُل دل کا نہیں کِھلتا

فضاؤں میں دعاؤں کے بہت بادل بھی بھیجے ہیں
مگر پھر بھی ہماری آس کا صحرا نہیں کھلتا

صنعتِ مراعات النظیر کے بہت سے اشعار عاشر کے کلام میں نظر آتے ہیں۔ کلام میں ایسی چیزوں کا ذکر جن میں تضاد کے علاوہ کوئی نسبت پائی جاتی ہو، مراعات النظیر ہے۔ مثلاً باغ کے ساتھ گُل، بُلبُل اور بہار کا ذکر کرنا۔ مراعات النظیر کے لیے تناسب، توفیق، ایتلاف، تلفیق اور مواخات کے الفاظ بھی مستعمل ہیں۔ عاشر نے اس صنعت کو ایسی تکنیک سے شعروں میں استعمال کیا ہے کہ ان اشعار میں فنّی حسن پیدا ہو گیا ہے۔

کہا اس نے کہ شاخِ زیست کے ہم برگِ آوارہ
کہا میں نے ہوائے تیز میں جھڑنا پڑا ہم کو

درج بالا شعر میں شاخِ زیست، برگِ آوارہ، ہوائے تیز اور جھڑنا مناسبتِ الفاظ کی مثال ہے۔ دو شعر دیکھیے۔

کبھی جو حبس کی رُت میں ہوائیں رُوٹھ جاتی ہیں
درختوں سے پرندوں کی وفائیں روٹھ جاتی ہیں

دیکھتے ہی دیکھتے بوجھل سماعت ہو گئی
داستاں کا میری ہر اک واقعہ پتھر کا تھا

صنعتِ تکریر یا تکرارِ لفظی کا استعمال ایک ہنر ہے اور شعر میں بہترین الفاظ کی تکرار کے لیے فنی مہارت درکار ہوتی ہے۔ آپ کے شعروں میں الفاظ کی تکرار آپ کی فنی چابک دستی کی دلیل ہے۔ الفاظ کی تکرار سے ان کے شعروں میں ایک خاص صوتی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس سے قاری محظوظ ہوتا ہے۔

اگر ربِ سخن مجھ کو کبھی اذنِ سخن دے دے
جہاں میں پھیل جائے گی مرے دیوان کی خوشبو

تمہارے ہجر کے لمحے بڑے بے درد ہیں جاناں
کہ ضبطِ غم نہیں ہے اب چلے آؤ چلے آؤ

عاشر کے بعض اشعار نثر کے قریب ہیں۔ انہیں پڑھتے ہوئے نثر کا گمان گزرتا ہے۔ نثر کی طرز پہ لکھے شعروں کے لیے صنعتِ نظم النثّر کی اصطلاح مستعمل ہے۔ ڈاکٹر مزمل حسین صنتِ نظم النثر کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''ایسا شعر یا ایسی نظم جسے مناسب اور موزوں تجزیے کے ساتھ بہ یک وقت نظم و نثر دونوں میں پڑھا جا سکے۔'' (۱۵)

ان اشعار کو نثری طرز پہ لکھیں تو یہ شعر نہیں بلکہ نثری جملے ہی معلوم ہوں۔ دیکھیے:

یہ جو کچھ دیکھتا ہے، سوچتا ہے بول دیتا ہے، مجھے سچ بولنے کا حوصلہ بچے سے ملتا ہے بام و در ہنسنے لگتے ہیں جب، وہ میرے گھر آتا ہے۔

جن کو بھرنے میں، اپنی زندگی لگی، ایک پل میں وہی گھاؤ سب کھل گئے جو کئے تھے رفو، تیری یاد آئی تو۔ اب ان نثر نما جملوں کو ان کی اصل حالت (شعروں) میں دیکھیں

یہ جو کچھ دیکھتا ہے، سوچتا ہے بول دیتا ہے
مجھے سچ بولنے کا حوصلہ بچے سے ملتا ہے

بام و در ہنسنے لگتے ہیں
جب وہ میرے گھر آتا ہے

جن کو بھرنے میں، اپنی زندگی لگی، ایک پل میں وہی
گھاؤ سب کھل گئے جو کئے تھے رفو تیری یاد آئی تو

صنعتِ منقوطہ کا اردو میں استعمال بہت مشکل ہے۔ نثر یا نظم کے سارے الفاظ نقطہ دار ہوں تو اسے اصطلاح میں صنعتِ منقوطہ کہا جاتا ہے۔ عاشر کے ہاں بہت سے مصرعے منقوطہ ہیں۔ جہاں تک شعروں کی بات ہے تو ان کے مختصر بحر کے کئی شعر منقوطہ ہیں۔

تیری پلکوں پر بھی اتریں
دیکھے ہیں جو میں نے خواب

کبھی جو ٹھان لیں عاشر
تو پھر کیا کیا نہیں کرتے

عاشر نے صنعتِ جمع کو بھی اپنی غزل میں خوب برتا ہے۔ ایسا شعر جس میں بہت سی چیزوں کا ذکر کیا جائے اور معنی کے اعتبار سے ان میں ایک ربط بھی ہو تو صنعتِ جمع ہے۔

وہی آنگن وہی کمرہ وہی دیوار و در گھر کے
صدائیں دے رہے ہیں سب چلے آؤ چلے آؤ

حنا، کاجل، نیا ملبوس، جھمکا بھول جاتا ہے
کوئی جب دور جائے تو سنورنا بھول جاتا ہے

عاشر کے شعروں میں صنعتِ تضاد موجود ہے۔ الفاظ میں جب ضد کا عنصر پایا جائے تو اسے

علمِ بدیع میں تضاد کا نام دیتے ہیں۔''صنعتِ تضاد کو صنعتِ طباق صنعتِ، تطبیق اور صنعتِ تکافو بھی کہا جاتا ہے۔''(۱۶)انگریزی میں اس کے لیے Anti-thesis کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔''ادیب ایک خاص قسم کے تاثر کو برقرار رکھنے یا شدت کے ساتھ ابھارنے کی غرض سے نحوی ساختوں میں اس نوع کی متوازیت کو قائم رکھتے ہیں۔بعض شعرا اور نثار کی طرزِ ادا کا ایک خاص پہلو ہے۔مثلاً شاعری میں پوپ اور ڈرائڈن،نثر میں بیکن،آسکر وائلڈ،چیسٹرٹن اور برناڈ شا کا اسلوب مجمع الضدین کا بہترین نمومہ ہے۔''(۱۷)ہمارے یہاں سجاد انصاری،رشید احمد صدیقی،آلِ احمد سرور اور جوگندر پال کی تحریروں میں یہ پہلو نمایاں ہے۔عاشر کے ہاں مکالماتی انداز کے شعروں میں بھی اس صنعت سے کام لیا گیا ہے۔ان کے ہاں تضادِ ایجابی کی صورت ملتی ہے۔یعنی ان کے شعروں میں متضاد الفاظ کے ساتھ حرفِ نفی نہیں آتا۔

کہا اس نے یہ کیسے دور میں جینا پڑا ہم کو
کہا میں نے کہ جینے کے لیے مرنا پڑا ہم کو

اگر صحرائے وحشت کی مسافت ہی مقدر تھی
تو ان آنکھوں کے کوزوں میں کوئی دریا تو رکھنا تھا

آپ کبھی تو ایک شعر کے ایک مصرعے میں جو لفظ لاتے ہیں،دوسرے مصرعے میں اس کا مقابل لفظ لاتے ہیں اور کبھی ایک ہی مصرعے میں دو متضاد الفاظ لاتے ہیں اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ان کے ایک شعر کے دونوں مصرعوں میں الگ الگ تضاد کا اہتمام ہوا ہے۔

بہار رُت میں خزاں کا خیال بھی ہے مجھے
خوشی کے ساتھ عجب اک ملال بھی ہے مجھے

مری ان جھیل آنکھوں کو
کبھی صحرا نہیں کرنا

ان کے ہاں استفہامیہ انداز کے ایسے شعر ہیں جو شعر کے رمزیہ تاثر میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ وہ اکثر داخلی کیفیات کو سوالیہ انداز سے شعری پیکر میں بیان کرتے ہیں۔ کہیں ان کے شعر کے دونوں مصرعے استفہامیہ ہیں، کہیں شعروں کے پہلے مصرعوں میں استفہامیہ انداز ہے۔ مکالماتی اشعار میں وہ پہلے مصرعے میں سوال کرتے ہیں جبکہ دوسرے مصرعے میں اس کا جواب دیتے ہیں۔

بچھڑ کے بھی مجھ سے تم نے جاناں نہ چین پایا تو کیا کرو گے؟
جو میری یادوں نے آگ بن کر یہ دل جلایا تو کیا کرو گے؟

یہ کس نے میرے سر پہ آسماں کا بوجھ رکھا ہے؟
کہ چلتا ہوں تو پیروں میں زمیں بھی ڈول جاتی ہے

کہا اس نے تمہیں کس بات نے مجبور کر ڈالا؟
کہا میں نے مسلسل مات نے مجبور کر ڈالا

کہا اس نے تری آنکھوں نے کیسا درد پہنا ہے؟
کہا میں نے یہی اک درد تو جیون کا گہنا ہے

اردو شاعری میں یک طرفہ مکالمے کی صورت تو اکثر شعرا کے ہاں ہے جس میں عاشق اپنے محبوب سے باتیں کرتا ہے، مگر دو طرفہ مکالمے کی صورت غزل میں کم دیکھنے کو ملی ہے اور یہ عاشر کا خاصہ ہے کہ اس نے جتنی مکالماتی غزلیں کہی ہیں غالباً اتنی مکالماتی غزلیں اردو شاعری کی تاریخ میں کسی نے نہیں کہیں۔ لفظ مکالمہ عربی الاصل ہے، یہ کلام سے ہے جس کا مطلب بات چیت اور گفتگو ہے۔ مکالمہ دو یا دو سے زیادہ افراد کے درمیان کی گفتگو کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ابتدائی مکالموں کا ذکر موجود ہے جو اللہ اور اس کے فرشتوں کے درمیان ہوئے تھے۔ سورہ البقرہ

کی آیت ۳۰ میں ذکر ہوا جس کا ترجمہ ہے:

''اور (وہ وقت یاد کریں) جب آپ کے ربّ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، انہوں نے عرض کیا: کیا تُو زمین میں کسی ایسے شخص کو (نائب) بنائے گا جو اس میں فساد انگیزی کرے گا اور خونریزی کرے گا؟ حالاں کہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہتے ہیں اور (ہمہ وقت) پاکیزگی بیان کرتے ہیں، (اللہ) نے فرمایا: میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔'' (۱۸)

مکالمہ دو اشخاص کے درمیان عام گفتگو سے ہٹ کر کسی اہم موضوع پر بھی ہوتا ہے جس کی مثال افلاطون کی تصنیف "Dialogue" ہے۔ ادب میں ڈراما ایسی صنف ہے جس میں سب سے زیادہ مکالماتی انداز ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ افسانوں اور ناولوں میں بھی کرداروں کا آپس میں مکالمہ ہوتا ہے مگر ڈراما کی نسبت فکشن میں کم مکالمے ہوتے ہیں۔ "Dictionary of literary terms" کے مطابق گفتار کی ایک دوسری صورت Stichomythia کہلاتی ہے جو بالخصوص ڈرامے میں دو کرداروں کے درمیان زبانی جدل کبھی سوال و جواب کی صورت میں، کبھی کبھی محض مسئلے پر بحث کی صورت میں ہوتی ہے۔ اس کے تحت مکالمات اکثر متبادل اور یک سطری ہوتے ہیں۔ اور ان میں حاضر جوابی کا عنصر شامل ہوتا ہے۔ اس کی مثال شیکسپیئر کے ڈراموں میں یک سطری مکالموں کی صورت میں ملتی ہے اور اسی تیکنیک کو عاشر وکیل راؤ نے اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے۔ مکالمہ کی اس صورت میں فوری تکرار بھی ہے، بے ساختگی بھی ہے، سلاست بھی ہے اور حاضر جوابی بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔'' (۱۹)

اردو غزل میں بہت سے تجربے ہوئے۔ نئے موضوعات لائے گئے، نئے الفاظ کا استعمال کیا گیا، لسانی تشکیلات اور پھر ہیئتی تجربے بھی سامنے آئے۔ لسانی تشکیلات، نئے اور مختلف الفاظ، مختلف ہیئتیں مطلعاتی غزل، مستزاد غزل، تکونی غزل، آزاد غزل وغیرہ۔ اس کے علاوہ اردو

میں نثری غزل کے تجربے بھی ہوئے۔مشتاق باسط کا شعری مجموعہ ’نثری غزلیں‘ایک مکمل مجموعہ ہے جس میں ساری غزلیں نثری ہیئت کی ہیں۔اردو غزل ایک خاص ہیئت رکھتی ہے،وہ اپنی ہیئت میں ہی کامیاب ومقبول ہے۔میرے خیال میں غزل کے مروجہ ہیئت کے علاوہ مستزادغزل ایک ایسی ہیئت ہے جس پر بہت سوں سے طبع آزمائی کی اور یہ تجربہ کامیاب ہوا۔آزادغزل میں فارغ بخاری اور قتیل شفائی جیسے نام سامنے آئے مگران تجربوں پر کڑی تنقید ہوئی۔نثری غزل کی تو سب سے زیادہ مخالفت ہوئی۔سچی بات تو یہ ہے کہ نثری صورت میں غزل ،غزل محسوس ہی نہیں ہوتی۔مکالماتی غزل بھی غزل کے انہی تجربوں میں سے ایک تجربہ ہے مگر یہ ایک کامیاب تجربہ ہے۔اردو شاعری میں مکالماتی انداز فارسی شاعری سے آیا۔فارسی میں عمر بن خیام کی رباعیاں مکالماتی طرز کی ہیں۔اس کے علاوہ امیر خسرو کا ایک فارسی کلام جس کا مطلع درج ذیل ہے اسی اسلوب کا ہے۔

گفتم کہ روشن از قمر گفتا کہ رخسارِ منست

گفتم کہ شیریں از شکر گفتا کہ گفتارِ منست

اردوغزل گوؤں میں سے چند ایک ایسے غزل گو ہیں جنہوں نے اس طرز پہ غزلیں کہیں۔اس طرز میں فردیات تو بہت سے شاعروں کے ہاں مل جاتے ہیں لیکن اس انداز میں پوری پوری غزلیں کہنے والوں میں عدیم ہاشمی،فاخرہ بتول،ارشد ملک،ارشد محمود ارشد،ثمینہ گل کے نام نمایاں ہیں۔پروفیسر شفیق آصف مکالماتی غزل کے پہلے شاعر عدیم ہاشمی کو بتاتے ہیں اور عاشر وکیل راؤ کو ان کا مقلد مانتے ہیں۔وہ اپنے مضمون ’’عاشر وکیل راؤ کا مکالماتی کلام‘‘میں لکھتے ہیں ’’مکالماتی غزل کی ابتداً اردوغزل کے ممتاز شاعر عدیم ہاشمی نے کی۔‘‘(۲۰) اگرچہ مکالماتی غزل کی مخالفت کی گئی مگر اس کی جتنی مخالفت ہوئی یہ اتنی ہی ابھر کر سامنے آئی۔ارشد محمود ارشد کہتے ہیں کہ’’عاشر کی مکالماتی شاعری نے مجھے بہت متاثر کیا اور اس سے مجھے مکالماتی غزل کہنے کی تحریک ملی۔اسے پڑھ کے میں نے ۱۸،۲۰ غزلیں اسی طرز میں لکھ ڈالیں۔‘‘(۲۱) یہ غزلیں ارشد محمود ارشد کے پہلے شعری مجموعے’عجب سی بے قراری ہے‘ میں شامل ہیں۔ان کے پہلے شعری

مجموعے ’’ابھی امکان باقی ہے‘‘ میں تین مکالماتی غزلیں موجود ہیں۔ دوسرے مجموعے ’’ترا ملنا ضروری ہے‘‘ میں دو مکالماتی غزلیں شامل ہیں۔ ان غزلوں کو بہت پسند کیا گیا اور اتنا سراہا گیا کہ ان کو مزید حوصلہ ملا اور ان کے بقول ’’مکالماتی غزلوں کا مجموعہ ’تم ہؤنا‘ کی تمام نظمیں اور غزلیں ۲ سے ۳ ہفتوں میں مکمل ہو گئیں اور یوں بہت جلد یہ کتاب ادبی منظر نامے پہ آئی‘‘ (۲۲)۔ ’’تم ہؤنا‘‘ پاکستان میں اردو شاعری کا پہلا مکمل مکالماتی مجموعہ ہے، جس کی تمام نظمیں اور غزلیں مکالماتی ہیں۔ اس مجموعے کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس میں حمد اور نعت بھی مکالماتی صورت میں ہے۔

کہا اس نے کبھی وہ روشنی تاریک کرتا ہے
کہا میں نے ہماری آنکھ کی تصدیق کرتا ہے

کہا اس نے بتاؤ تو تمہیں کیا غم ستاتا ہے
کہا میں نے مجھے ہر پل مدینہ یاد آتا ہے

کہا اس نے مرے ہونے کا یہ احساس تم ہؤنا
کہا میں نے کہ جیون کی حسیں اک آس تم ہؤنا

میں کہتا ہوں مجھے پلکوں کی چھاؤں میں سدا رکھنا
وہ کہتی ہے مجھے شامل دعاؤں میں سدا رکھنا

کہا میں نے تری آنکھوں کی حیرانی نہیں جاتی
کہا اس نے کہ حیرت کی فراوانی نہیں جاتی

’’تم ہؤنا‘ کی تقریبِ رونمائی اکادمی ادبیات میں ہوئی جس کی صدارت دورِ حاضر

کے نمائندہ شاعر افتخار عارف نے کی اور انہوں نے مکالماتی غزل کو سراہا‘‘(۲۳)۔ پروفیسر ڈاکٹر شفیق آصف کہتے ہیں’’میں مکالماتی غزل کے تجربے کو ایک کامیاب غزلیہ تجربہ سمجھتا ہوں۔‘‘(۲۴) مکالماتی غزلوں میں وہ اپنے محبوب سے مکالمہ کرتے ہیں۔ان کے مکالمہ رومانی طرز کا ہے۔وہ اپنے محبوب سے عشق و محبت کی باتیں بڑے دلآویز انداز سے کرتے ہیں۔

کہا میں نے خموشی یہ تری انکار ہی تو ہے
کہا مسکان ہونٹوں کی مرا اقرار ہی تو ہے
کہا میں نے تمہیں سجنا سنورنا کیوں نہیں بھاتا
کہا اس نے تری چاہت مرا سنگھار ہی تو ہے

سرگودھا کے شاعر و ادیب ذوالفقار احسن نے درست کہا تھا کہ:

’’ان کی مکالماتی غزل میں خود کلامی کی تکنیک ہے‘‘۔(۲۵)

یہی تکنیک ہمیں امیر خسرو کے فارسی مکالماتی کلام میں ملتی ہے۔

گفتم کہ حوری یا پری، گفتا کہ من شاہِ بتاں
گفتم کہ خسرو ناتواں، گفتا پرستار منست

عاشر جس سے مکالمہ کرتے ہیں وہ دوسرا شخص ان کا دوست بھی ہے اور مشیر بھی، معاون بھی ہے اور رہبر بھی۔۔۔۔۔وہ اپنے مسائل و معاملات اپنے ساتھی سے disscuss کرتے ہیں۔سیاست، معیشت، ملکی حالات، زوالِ اقدار ایسے موضوعات کو جس فنی مہارت سے مکالماتی صورت میں پیش کیا ہے، یہ انہی کا حصہ ہے۔ان کی مکالماتی غزلوں کا انداز یوں ہے کہ شعر کے پہلے مصرعے میں ’کہا اس نے‘ اور دوسرے مصرعے میں ’کہا میں نے‘ کے الفاظ سے مکالماتی فضا بناتے ہیں۔کبھی ’وہ کہتی ہے۔۔۔‘ اور ’میں کہتا ہوں۔۔۔‘ سے مصرعوں کا آغاز کرتے ہیں۔اس دوسری صورت میں پہلے مصرعے میں صیغہ مؤنث ہے اور دوسرے مصرعے میں صیغہ مذکر ہے۔وہ پہلے اپنی محبوبہ کی گفتگو کو شعری صورت میں نظم کرتے ہیں اور بعد میں اپنی گفتگو سناتے ہیں۔یہی

محبت کا تقاضا ہے۔ اردو شاعری کا محب اپنے محبوب کو خود سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ عاشر خود کہتے ہیں کہ ''میں نے اس کتاب کا نام 'میں ہوں نا' کے بجائے 'تم ہؤنا' بھی اسی لئے رکھا کہ محبت میں 'میں' نہیں بلکہ تو ہی تو ہوتا ہے۔''(۲۶) دراصل عاشر نے اس شعری مجموعے کا نام ایک انڈین فلم ''میں ہوں' نا'' سے متاثر ہو کر رکھا تھا مگر اس میں یوں تبدیلی کی کہ ''میں ہوں' نا'' کو ''تم ہؤنا'' کر دیا۔ محب کو ہر جگہ اپنا محبوب دکھتا ہے۔ وہ میں سے نکل کر تو میں غلو کرتا چلا جاتا ہے۔ ایک عاشق کے لئے اپنی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اس کے لیے اس کا محبوب ہی سب کچھ ہوتا ہے۔

کہا اس نے بھلا مجھ میں تمہیں کیا چیز بھاتی ہے
کہا میں نے تمہیں دیکھوں تو جاں میں جان آتی ہے

وہ کہتی ہے مری نظروں سے تم اوجھل نہ ہو جانا
میں کہتا ہوں یہی تم سوچ کر پاگل نہ ہو جانا

وہ کہتی ہے مجھے تم پر بہت ہی مان ہے عاشرؔ
میں کہتا ہوں اری چھوڑو، بہت نادان ہے عاشرؔ

بہر حال مکالماتی غزل ابھی مزید توجہ چاہتی ہے:

''مکالماتی غزل کے حوالے سے مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔''(۲۷)

عاشر کا اسلوبِ شعر منفرد ہے۔ مندرجہ بالا خصائص اس کی غزل کو نکھارتے ہیں۔ اس کا طرزِ شعر خوب ہے۔ یہی اندازِ بیان ایک ہی مضمون کو کئی سانچوں میں ڈھالتا ہے۔ عاشر کی شاعری کی انہی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے پروفیسر ریاض احمد شاد نے لکھا ہے کہ ''اس کے پیرایۂ اظہار میں نوجوان شعراوالا کچا پن نہیں ملتا، بلکہ وہ نرم و نازک جذبات کے اظہار کا ہنر جانتا ہے۔''(۲۸)

حوالہ جات

۱۔ طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، نگارشات پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص: ۱۸۔

۲۔ محمد رؤف، اردو غزل مابعد نوآبادیاتی مطالعہ، روہی بکس، فیصل آباد، جون ۲۰۱۵ء، ص ۶۳، بحوالہ: جدیدیت اور نئی شاعری، از: شمیم حنفی، ص: ۴۰۔

۳۔ عطاء الرحمان تمثیل، خوشبو، مشمولہ: عاشر وکیل، مشمولہ: ترا ملنا ضروری ہے، از: عاشر وکیل راؤ، وقارِ قلم پبلی کیشنز، لاہور، جنوری ۲۰۰۲ء، ص: ۲۴۔

۴۔ مرزا نصیر خالد، محبت کا قتیل۔۔۔عاشر وکیل، مشمولہ: ترا ملنا ضروری ہے، از: عاشر وکیل راؤ، وقارِ قلم پبلی کیشنز، لاہور، جنوری ۲۰۰۲ء، ص: ۱۳۔

۵۔ سرور الہدیٰ، ڈاکٹر، نئی اردو غزل، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۳۹۔

۶۔ عاشر وکیل راؤ، مصاحبہ، سرگودھا، ۱۵۔ جون ۲۰۱۸ء۔

۷۔ ازور عباس، سید، سرگودھا کی اردو غزل کا موضوعی و اسالیبی مطالعہ، مقالہ برائے بی۔ ایس۔ ۲۰۱۲۔۲۰۱۶ء، جامعہ سرگودھا، ص: ۲۰۲۔

۸۔ شان الحق حقی، مرتبہ، فرہنگِ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبعِ اوّل، ۱۹۹۵ء، ص: ۳۰۲۔

۹۔ عاشر وکیل راؤ، مصاحبہ، سرگودھا، ۱۵۔ جون ۲۰۱۸ء۔

۱۰۔ اسد اعوان، شاعرِ طرحِ نو عاشر وکیل راؤ، مشمولہ: تم ہوئے، از: عاشر وکیل راؤ، دعا پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص: ۲۵۔

۱۱۔ https://ur.wikipedia.org/wiki/تشبیہ۔

۱۲۔ مزمل حسین، ڈاکٹر، اُردو میں علمِ بیان اور علمِ بدیع کے مَباحث، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، جولائی، ۲۰۱۰ء، ص: ۱۷۷۔

۱۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ ۲۰۱۱ء، ص: ۴۶۔

۱۴۔ عابد علی عابد، سید، اسلوب، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، طبع دوم، جون ۱۹۹۶ء، ص: ۱۸۹۔

۱۵۔ مزمّل حسین، ڈاکٹر، اُردُو میں عِلمِ بیان اور علمِ بدیع کے مَباحث، ایضاً، ص:۱۵۹۔

۱۶۔ حفیظ صدیقی، ابوالاعجاز، مرتبہ، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، دوم، ستمبر ۱۹۸۵ء، ص:۴۰۔

۱۷۔ عتیق اللہ، پروفیسر، ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ، جلد اول، اردو مجلس، دہلی، ص:۲۱۱۔

۱۸۔ محمد طاہر القادری، علامہ، پروفیسر، ڈاکٹر، عرفان القرآن، منہاج القرآن پبلی کیشنز، لاہور، جنوری ۲۰۱۲ء، سورہ البقرہ، آیت:۳۰ ص ۱۳۔

۱۹۔ شاکر کنڈان، پروفیسر، پیش لفظ، مشمولہ: تم ہوئنا، عاشر وکیل راؤ، دعا پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص:۱۱۔۱۲

۲۰۔ شفیق آصف، پروفیسر، عاشر وکیل راؤ کا مکالماتی کلام، مشمولہ: تم ہوئنا، عاشر وکیل راؤ، دعا پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص:۲۲۔

۲۱۔ ارشد محمود ارشد، مصاحبہ، سرگودھا، ۲۸۔اپریل ۲۰۱۸ء۔

۲۲۔ عاشر وکیل راؤ، مصاحبہ، سرگودھا، ۱۵۔جون ۲۰۱۸ء۔

۲۳۔ ارشد محمود ارشد، مصاحبہ، سرگودھا، ایضاً۔

۲۴۔ شفیق آصف، پروفیسر ڈاکٹر، مصاحبہ، سرگودھا، ۲۸۔اپریل ۲۰۱۸ء۔

۲۵۔ ذوالفقار احسن، مصاحبہ، سرگودھا، ۲۰۔اپریل ۲۰۱۸ء۔

۲۶۔ عاشر وکیل راؤ، مصاحبہ، سرگودھا، ایضاً۔

۲۷۔ شفیق آصف، پروفیسر ڈاکٹر، مصاحبہ، سرگودھا، ایضاً۔

۲۸۔ ریاض احمد شاد، پروفیسر، عاشر وکیل راؤ۔۔۔ایک پختہ شاعر، مشمولہ: ترا ملنا ضروری ہے، وقارِ قلم پبلی کیشنز، لاہور، جنوری ۲۰۰۲ء، ص:۲۰۔

باب چہارم

عاشر کی نظم کا فکری و فنی مطالعہ

اردو نظم کی ابتدائی نمونے قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی ہیں۔ یہ اصناف عربی اور فارسی سے آئیں۔ البتہ ان اصناف سے ہٹ کر پابند اردو نظم کا آغاز نظیر اکبرآبادی سے ہوتا ہے۔ نظیر درباری نہیں عوامی شاعر تھے جنہوں نے اپنی نظموں میں عوام کے مسائل کو موضوع بنایا۔ بعدازاں حالی اور آزاد نے اس کی طرف توجہ دی اور مناظموں کا اہتمام کیا۔ اقبال کی فکر کا بہترین اظہار ان کی نظموں میں ہوا۔ بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک نے غزل پر نظم کو ترجیح دی اور اس کے ذریعے اپنے نظریے کی تبلیغ کی۔ مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، خلیل الرحمان اعظمی، کیفی اعظمی، مجاز، جاں نثار اختر، مبارک حیدر، نیاز حیدر، اختر الایمان، فیض سامنے آئے تو دوسری طرف ن م راشد، میرا جی اور تصدق حسین خالد نظم کی نئی ہیئت کے ساتھ ابھرے اور جدید نظم میں ایک نام پیدا کیا۔ رومانی نظموں کے ساتھ ساتھ انقلابی نظمیں کا رجحان پڑا۔ جوش نے مزاحمتی اور انقلابی شاعری کو رواج دیا۔ فیض کا رجحان معریٰ نظموں کی طرف رہا۔ ۶۰ء کی دہائی میں مجید امجد نظم نئے موضوعات اور نئی ہیئتوں کے ساتھ ادبی منظر نامے پر آئے۔ اسی زمانے میں مختصر ترین نظم کو منیر نیازی نے متعارف کروایا۔ مجید امجد، راشد اور میرا جی نے آزاد نظمیں لکھیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا نام نئی نظم میں معروف نام ہے۔ ان کی نظمیں ثقافت کی نمائندہ ہیں۔ بعدازاں نثری نظم کی ابتدا ہوئی۔ یوں نظم کے موضوعات میں بھی وسعت آئی اور نئی نئی ہیئتوں کے تجربات بھی ہوئے۔

عاشر وکیل راؤ کا بنیادی حوالہ غزل ہے البتہ اس نے نظمیں بھی کہیں۔ غزل کی طرح اس کی نظم کا بڑا موضوع محبت ہے۔ ''وہی حقیقتِ ثابتہ یعنی محبت ہی عاشر وکیل راؤ کی نظموں کا

موضوع ہے اور اس موضوع سے انہوں نے پوری طرح انصاف کیا ہے۔''(۱) یہی محبت عاشر کو شعر کہنے پر ابھارتی ہے۔ عاشر کی محبت خالص ہے۔ اس کے نزدیک محبت بڑے بڑے مسائل کا حل ہے۔ 'اعجازِ لمس'، 'کیسے بھول سکتا ہے'، 'ترا ملنا ضروری ہے'، 'اعتراف'، 'چلو اب مان جاؤ تم'، 'چلو اقرار کرتے ہیں'، 'محبت پھر محبت ہے'، 'سپنوں کی کہکشاں'، 'تم ہو'نا' ایسی نظموں کا موضوع محبت ہے۔ محبت شدت اختیار کر جائے تو کیا حال کرتی ہے۔ عاشر اس کے ہر دو پہلوؤں کو نظم کرتے ہیں۔

محبت پھر محبت ہے
کبھی دل سے نہیں جاتی
کہ لاکھوں رنگ ہیں اس کے
عجب ہی ڈھنگ ہیں اس کے
کبھی صحرا، کبھی دریا

کبھی خوشیاں کبھی آنسو
ہزاروں روپ رکھتی ہے
بدن جھلسا کے جو رکھ دے
کبھی وہ دھوپ رکھتی ہے
کبھی بن کر یہ اک جگنو
شبِ غم کے اندھیروں میں
دلوں کو آس دیتی ہے
کبھی منزل کنارے پر

یہ صدیوں کے مسافر کو
فقط اک یاس دیتی ہے
اذیت ہی اذیت ہے
محبت پھر محبت ہے

(محبت پھر محبت ہے)

عاشر کی نظم 'سپنوں کی کہکشاں' ایک منفرد نظم ہے جس میں محبت کا اظہار اور اس کے کئی پہلوؤں کو نظم کیا گیا ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے جس میں مختلف کیفیات کا ذکر ہے۔ عاشر نے ایک ہی محبت کی اور اسے پانے کے لیے مسلسل محنت کرتا رہا۔ عاشر اپنی محبوبہ سے شادی کے بعد کی زندگی کی باتیں کرتے ہیں۔ ان کا عشق سچا ہے اور ایک عام محب کا رویہ ہے۔ وہ آسمان سے تارے توڑنے کی بات نہیں کرتے بلکہ زمینی اور گھریلو معاملات کا ذکر کرتے ہیں۔ خیالی باتوں کے بجائے practicle life گزارنے کی باتیں کرتے ہیں۔ اس قسم کی نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے شاکر کنڈان نے کہا تھا:

''عاشر نے شاعری سے خودنوشت کا کام لیا ہے۔''(۲)

گویا عاشر اپنی محبت والی زندگی کو نظم کرتے ہیں۔ شعر ایسے نہیں جن میں صرف خیالی باتیں ہوں بلکہ وہ جیتی جاگتی زیست گزارتے ہیں۔ ان کا محبوب گوشت پوست کا انسان ہے۔ اور عاشق و معشوق عام انسان کی زیست بسر کر رہے ہیں۔

کہا میں نے کبھی آیا جو ساون کیا کریں گے ہم
کہا اس نے کہ آنگن میں لگے جھولوں پہ جھولیں گے
کچن میں دونوں مل کے ہم کئی چیزیں پکائیں گے
پھر اک دوجے کے ہاتھوں سے مزے لے لے کے کھائیں گے

کہااس نے جنم دن تیرا میرا جب بھی آئے گا
تو چپکے سے خموشی سے کوئی تحفہ خریدیں گے
اچانک وش کریں گے پھر یہ اک دوجے سے کہہ کر ہم
کہ جانو جی! مبارک ہو بہت یہ دلربا لمحے

(سپنوں کی کہکشاں)

''سپنوں کی کہکشاں' ایک خوبصورت نظم ہے جو اپنے اندر محبت کا بحرِ بیکراں سموئے ہوئے ہے۔''(۳) عاشر کی محبت صرف ایک شخص تک محدود نہیں بلکہ مجازی محبت میں وہ اپنے رشتوں سے دلی لگاؤ کا اظہار بھی کرتے ہیں۔اس کی مثالیں ان کی نظمیں ''ابو جی کے لیے'' اور ''چچا جی کے لیے'' ہیں۔انہوں نے یہ نظمیں اپنے والد اور چچا کی وفات کے بعد لکھیں جن میں ان سے ملنے والی محبت اور ان کی یادیں محفوظ ہیں۔

عاشر ہجر و وصال ایسے مضامین کو اپنی نظموں میں جگہ دیتے ہیں۔ہجر کے لمحات بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں۔یہ لمحات صدیوں برابر ہوتے ہیں جیسے وقت رُک سا گیا ہو۔وہ ہجر کو ذات کی تکمیلیت کی نفی سمجھتے ہیں۔۔دوری، عاشر کے لیے موت سے کم نہیں۔وہ ہجر کو 'عزرائیل' لمحہ کہتے ہیں۔ہجر عاشق کا دشمن ہے۔یہ اس کی خوشیاں چھین لیتا ہے۔ہجر کا ہر لمحہ عاشر کو سزا اور جیون خطا معلوم ہوتا ہے۔

لو ہجر کا عزرائیل لمحہ
سبھی دعاؤں کو مات کر کے
ہماری قسمت سے بات کر کے
وصال لمحوں کی تتلیوں کی
حسین سپنوں کے جگنوؤں کی
یہ جان لینے کو آن پہنچا

اس ایک لمحے کے ڈر نے ہم سے
ہماری آنکھوں کی نیند چھینی
ہمارے لب سے ہنسی چرائی
ہمارے دل کا قرار لُوٹا
نہ اس نے پھر بھی سکون پایا
اس ایک لمحے کے ڈر نے ہم کو
بہت ستایا بہت رُلایا
یہ ہجر کا عزرائیل لمحہ

(عزرائیل)

عاشر وصال کے طلبگار ہیں۔ وصال کے لمحات ہی عاشر کے لیے زندگی کا حاصل ہیں۔ وصال سببِ خوشی ہے۔ ان کا سفر ُابھی امکان باقی ہے' سے 'ترا ملنا ضروری ہے' اور 'تم ہو'نا' سے 'میں مکمل ہوا' ہجر سے وصال تک کا سفر ہے۔ جس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ محبوب کا قرب عاشق کا تن من مہکا دیتا ہے۔ وہ قرب میں 'اعجازِ لمس' تک جاتے ہیں۔ جس سے ان کے بدن کی سوکھتی شاخیں ہری ہو جاتی ہیں۔ اور جسمِ بُریدہ صحیح و سالم ہو جاتا ہے۔ وہ خوشیوں کے خزانے وصال میں ڈھونڈتے ہیں۔

یہ خواہش لاشعوری ہے
سفر میں زندگانی کے
ترا ملنا ضروری ہے

(ترا ملنا ضروری ہے)

تمہارے لمس کے اعجاز نے
بنجر زمیں کی سوکھتی پرخار شاخوں پر
دھنک جذبوں کے مہکی ساعتوں کے
گل کھلا ڈالے

اس نظم کے آخر میں لکھتے ہیں:

مری جامد رگوں کے اس
بہت ہی سرد خوں میں بھی حرارت کی جو لو دہکی
ترے دستِ شفائی نے مرے جسمِ بریدہ کو
نیا اک پیرہن بخشا مجھے پھر سے کیا زندہ
تمہاری چاہتوں نے ہی کیا ہے جاوداں مجھ کو
ترے اس لمس نے جاناں کیا ہے پھر جواں مجھ کو
(اعجازِ لمس)

عاشر نے حمدیہ اور دعائیہ نظمیں بھی لکھیں۔ وہ حمد میں اللہ تعالیٰ کی تعریف و توصیف کرتے ہیں۔ وہ اللہ پاک کی صفات کا ذکر صنعتِ تضاد کے استعمال کے ساتھ ساتھ مکالماتی طرز سے کرتے ہیں جو ان کی فنِ شعر پر دلیل ہے۔ وہ اس ذات پر مکمل ایمان رکھتے ہیں۔ دعائیہ اشعار میں وہ عاجزی سے اپنا دامن بارگاہِ ایزدی میں پھیلاتے ہیں اور طلب کرتے ہیں۔

کہا اس نے بلندی سے کبھی پستی میں لاتا ہے
کہا میں نے جو کرتا ہے وہ بالکل ٹھیک کرتا ہے
کہا میں نے کسی پل وہ نوازش ہی نوازش ہے
کہا میں نے کسی پل وہ بہت تضحیک کرتا ہے

میں نفی ہوں تو مثبت بنا دے سخی
مجھ کو لفظوں کی حرمت سکھا دے سخی
میں تو عاجز ہوں، نا چیز بھی ہوں مگر
میرے فن کو تو فکرِ رسا دے سخی

نعت حضور نبی کریم کی مدح وستائش کو کہتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ شاعر کا آپ سے عشقیہ جذبات کا اظہار اور صفاتِ محمدیہ ﷺ کا ذکر کرنا بھی نعت ہے۔عاشر دل سے نعت کہتا ہے۔اس کی نعتوں میں ادب و عاجزی نمایاں ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اس کی لکھی نعتوں سے ان کے حضور کی ذات سے متعلق عقائد واضح طور پر سامنے آ گئے ہیں۔

انہیں حضور سے خالص عقیدت و محبت ہے۔کئی بار درِ رسولؐ ﷺ پہ حاضری کا شرف حاصل کر چکے ہیں۔ایک عاشقِ رسول کے لیے سب سے تکلیف دہ لمحہ درِ حضور سے واپسی کا لمحہ ہوتا ہے۔عاشر کو مدینے کا غم ستاتا ہے۔وہ اپنی زندگی مدینہ پاک میں بسر کرنے کے خواہش مند ہیں۔نہ صرف زندگی بلکہ موت و مدفن بھی اسی بلدالامین میں چاہتے ہیں۔

پھر سامنے ہے غم کی منجدھار یا محمد ﷺ
تو حوصلے کی دے دے پتوار یا محمد ﷺ

کہا اس نے بتاؤ تو تمہیں یا غم ستاتا ہے
کہا میں نے مجھے ہر پل مدینہ یاد آتا ہے
کہا اس نے دعائیں کس لیے واپس نہ آنے کی
کہا میں نے ہے خوش قسمت بقیع مدفن جو پاتا ہے

انہوں نے وجودِ انسانی کو بھی موضوعِ نظم بنایا ہے۔سائنسی حوالے سے انسانی وجود کا ذکر کرتے ہوئے تین عناصر ہوا، پانی اور آگ کا ذکر کرتے ہوئے ایک ماحول پیدا کرتے

ہیں۔ جیسے وجودیت کو انہوں نے اپنی غزل کا موضوع بنایا ویسے ہی نظم میں بھی وجودِ انسانی کی قدر و اہمیت کا ذکر کرتے ہیں اگرچہ وہ اپنے محبوب سے بات کر رہے ہیں ،محبوب کی محب کے لیے اہمیت بیان کرتے ہیں مگر اس موضوع کو انہوں نے سائنس اور رومان سے وسعت دے دی ہے۔ ''سوال''،نظم دیکھیے:

تم تو کہتے تھے
کہ میری اہمیت تمہاری زندگی میں
اتنی ہی ہے جتنی کہ
ہوا، پانی، اور روشنی کی
تو کہو
ہماری جدائی کو تو اک عرصہ ہوا
تم اب تلک زندہ کیسے ہو؟

(سوال)

عاشر کی نظم نگاری کے فنی خصوصیات کا جائزہ لیں تو ان میں صنعتِ تضاد، انگریزی الفاظ کا استعمال، مکالماتی اسلوب کے علاوہ ہیئتوں کے مختلف تجربے شامل ہیں۔

صنعتِ تضاد کی مثال دیکھیے:

کبھی یہ جیت دیتی ہے
کبھی یہ ہار دیتی ہے
کبھی زندہ یہ کرتی ہے
کبھی یہ مار دیتی ہے

(محبت پھر محبت ہے)

اردو شاعری میں انگریزی کے الفاظ بیسویں صدی میں داخل ہونا شروع ہوئے۔

انگریزوں کی ہندوستان آمد اور یہاں کے مختلف محکموں میں انگریزی کے رائج ہونے سے علم و ادب پر اس زبان کے اثرات پڑے۔ اکبرالہٰ آبادی نے پہلی بار اردو شاعری میں انگریزی کے الفاظ کا استعمال کیا۔ عاشر کی نظموں بالخصوص ''سپنوں کی کہکشاں'' میں کئی انگریزی الفاظ موجود ہیں۔ اس نظم کے دو شعر درج ذیل ہیں۔

اگر یکسانیت سے ہم کبھی بیزار ہو جائیں
تو بائیک پر پھر اپنی بیٹھ کر ہم گھر سے نکلیں گے
مگر احساس ہو گا جب تو اک دوجے سے فوراً ہی
بس اک چاہت بھرے لہجے میں پھر سوری کہیں گے ہم

(سپنوں کی کہکشاں)

''تم ہو نا'' اور ''سپنوں کی کہکشاں'' مکالماتی طرز کی نظمیں ہیں۔ آخر الذکر نظم کے بارے مرزا نصیر نے کہا تھا ''سپنوں کی کہکشاں' ایک طویل مکالماتی نظم ہے جو خاص حلقوں سے یقیناً پذیرائی حاصل کرے گی۔'' (۴) اور واقعی اس نظم کو بہت سے شاعروں نے سراہا۔ جن میں وہ اپنے محبوب سے مکالمہ کرتے ہیں۔ عاشر نے ان مکالماتی نظموں میں رومانی طرز کو شامل کر کے اس کے تاثر میں اضافہ کیا ہے۔ یہ نظمیں مربع، مخمس، مسدس بندوں کی صورت میں ہیں۔ بعض بند بارہ، چودہ مصرعوں پر بھی ہیں۔

کہا خوش بخت ہوں میں کہ مرے جیون میں تم ہو نا
مری آنکھوں، مری سانسوں، مری دھڑکن میں تم ہو نا
کہا جگ سے نہیں مجھ کو ذرا رغبت کہ تم ہو نا

مری دولت، مری قسمت، مری چاہت کہ تم ہو نا
تھکا مجھ کو نہیں سکتا کوئی بھی غم کہ تم ہو نا

مری پلکیں کبھی ہوں گی نہیں پُرنم کہ تم ہونا
کہا معلوم ہے کتنے ہی بندھن ٹوٹ جائیں گے
کہا معلوم ہے کتنے ہی اپنے روٹھ جائیں گے
کہا اتنا ہی کافی ہے مرے ہمدم کہ تم ہونا
جھکا مجھ کو نہیں سکتی کبھی رسمیں کہ تم ہونا
میں پوری کر دکھاؤں گا سبھی رسمیں کہ تم ہونا
کہا تم ہو تو جیون کے سبھی رستے سنور جائیں
کہا تم ہو تو پھولوں کے حسیں موسم ٹھہر جائیں
کہا تم ہو تو چاہت کی حدوں سے ہم گزر جائیں
کہا تم ہو تو قربت کے سبھی لمحے نکھر جائیں

دوسرا بند:

تمہارے بن تو ہر لمحہ سزا معلوم ہوتا تھا
تمہارے بن مقدر بھی خفا معلوم ہوتا تھا
تمہارے بن تو یہ جیون خطا معلوم ہوتا تھا
تمہارے بن تو جینا بددعا معلوم ہوتا تھا

عاشر کے ہاں پابند نظم کے علاوہ آزاد نظم بھی موجود ہے۔ انگریزی نظموں کے اثرات اور تراجم سے اردو نظم میں نئی ہیئتوں کے تجربے ہوئے۔ آزاد نظم قافیہ ردیف کے بغیر ہوتی ہے۔ یہ نظم کسی بحر میں تو ہوتی ہے مگر اس کے مصرعے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں۔ گویا مصرعوں کے ارکان کم و بیش ہوتے ہیں۔ 'تمسخر'، 'کچھ سپنے'، ''چلو اب مان جاؤ تم'، 'فیصلہ'، 'اعجازِ لمس'، 'ابھی تک سانس لیتے ہیں'، آزاد نظمیں ہیں۔

کچھ سپنے تو
بنا پروں کے پنچھی جیسے ہوتے ہیں
لاکھ اڑاؤ آنکھ سے ان کو
پھر واپس آ جاتے ہیں

(کچھ سپنے۔۔۔)

ایک اور آزاد نظم کے ابتدائی مصرعے ملاحظہ ہوں

بس!
بہت سن لی دلِ پاگل تری ہم نے
محبت اب نہیں ہو گی
کہ جذبوں کا مہکتا گلستاں ہو چاہے آنکھوں میں

(فیصلہ)

''عاشر وکیل راؤ کی آزاد نظم زندگی کے تمام خوبصورت رنگوں سے مزین ہے۔''(۵)

عاشر نے نظمِ معریٰ میں بھی طبع آزمائی کی۔ نظمِ معریٰ میں مصرعے وزن میں برابر ہوتے ہیں البتہ یہ قافیہ ردیف سے آزاد ہوتی ہے۔ ''الجھن'' اور ''کبھی اک پل تو سوچو تم'' معریٰ نظمیں ہیں۔

مرا وجدان کہتا ہے
اگر ہے زندگی پیاری
کبھی بھی تم نہیں سونا
مگر یہ بھی حقیقت ہے
مسلسل رتجگے بھی تو

مرے خوابوں کے قاتل ہیں
میں اس الجھن میں الجھا ہوں

گر سوتا ہوں اک پل کو
تو شاید جان سے جاؤں
اگر میں عمر بھر جاگوں
تو سپنے ٹوٹ جائیں گے

(الجھن)

عاشر نے نثری نظمیں بھی لکھیں۔نثری نظم کو نثم بھی کہا جاتا ہے۔یہ کوئی الگ صنف نہیں۔ اس کی ہیئت نثری ہے۔اس کے مصرعے نثر کی طرز پہ لکھے جاتے ہیں۔کوئی مصرع باوزن نہیں ہوتا۔یہ مکمل نظم بحر سے خارج ہوتی ہے البتہ اس میں شعریت موجود ہوتی ہے۔صنائع بدائع سے کام لیا جاتا ہے۔نثری نظم کو بہت سے ادبا نظم تسلیم ہی نہیں کرتے۔افضال احمد سید،سلیم آغا، نجمہ منصور،منزہ شاہ وغیرہ نثری نظم کے مبتدی ہیں۔'سوال'،' آج پھر دلِ تباہ پر عذاب ٹوٹے گا'،'سنو میرے بے خبر'،'ڈیٹ ایکسپائرڈ'،' سکینڈل' عاشر کی نثری نظمیں ہیں۔

ہمارے دردِ دل کی ایک ہی دوا تھی
مگر آج
تمہارے لہجے کی تبدیلی سے
اندازہ ہوا کہ
شاید اس دوا کی Date بھی Expired ہو چکی ہے

(ڈیٹ ایکسپائرڈ)

بہت احتیاط کرتا ہوں

لبوں پر تبسم کی دھنک بھی سجائے رکھتا ہوں

حتیٰ کہ اکیلے تنہائی میں بھی بہت محتاط رہتا ہوں

مگر پھر بھی نجانے کیوں

کسی نہ کسی غم سے

میرا اسکینڈل بن جاتا ہے

(سکینڈل)

عاشر کی بعض نظمیں غزل کی ہیئت پہ ہیں۔''ابو جی کے لیے''،''چچا جی کے لیے''اور ''کاش کبھی ایسا ہو جائے''غزل کی ہیئت پہ لکھی گئی نظمیں ہیں کہ ان کا ہر شعر الگ موضوع رکھتا ہے مگر ان نظموں پہ سر نامہ موجود ہے۔

کاش کبھی ایسا ہو جائے

میں سوچوں اور تو آ جائے

چھو کے تجھ کو دیکھ بھی لوں اور

ہاتھ بھی جلنے سے بچ جائے

لمحوں کو پھر قید میں کر لوں

قرب ترا تن من مہکائے

(کاش کبھی ایسا ہو جائے)

عاشر نے اگرچہ بہت سی ہیئتوں کی نظمیں کہیں مگر ان کی نظموں میں کچھ خامیاں بھی ہیں۔نثری نظم میں کوئی مصرع وزن میں نہیں ہوتا جبکہ اوپر تحریر کردہ نثری نظم (سکینڈل) میں چوتھا مصرع باوزن ہے۔

اسی طرح کئی نظموں میں چار مصرعے ایک بحر کے پھر دو مصرعے الگ بحر کے پھر آٹھ دس مصرعے ایک الگ بحر کے ہیں۔بعض نظموں میں ایک آدھ مصرعے سے فنی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو عاشر کی نظموں میں کوئی بڑا فلسفہ موجود نہیں ہے۔اور نظم کے موضوعات خاصے محدود ہیں۔اکثر نظمیں مختصر ہیں۔فنی حوالے سے زیادہ پختہ نہیں ہیں۔
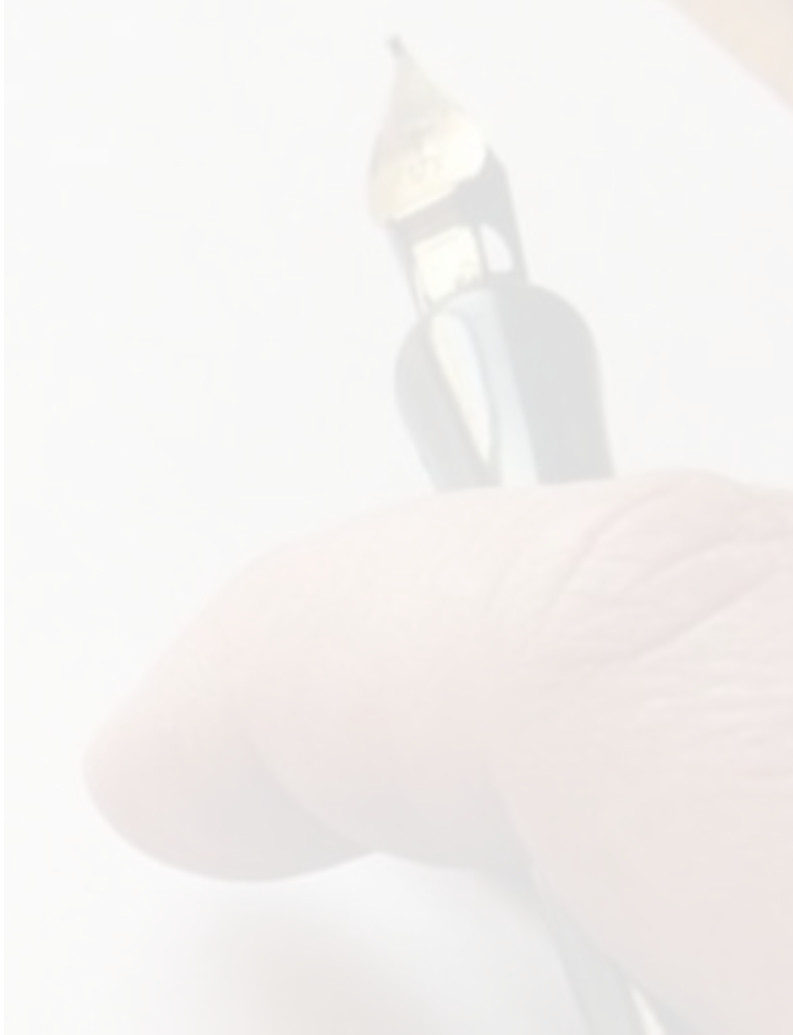
حوالہ جات

۱۔ محبت کا قتیل ۔۔۔۔عاشر وکیل ۔مرزا نصیر خالد، مشمولہ: ترا ملنا ضروری ہے، از: عاشر وکیل راؤ، وقارِ قلم پبلی کیشنز، جنوری ۲۰۰۲ء، ص۱۶۔

۲۔ پیش لفظ، شاکر کنڈان، مشمولہ: تم ہؤنا، از: عاشر وکیل راؤ، دعا پبلی کیشنز، لاہور ِ ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۔

۳۔ شفیق آصف، عاشر وکیل راؤ کا مکالماتی کلام، مشمولہ: تم ہؤنا، ایضاً ص: ۲۴۔

۴۔ مرزا نصیر خالد، محبت کا قتیل ۔۔۔۔عاشر وکیل، مشمولہ: ترا ملنا ضروری ہے، ایضاً ص۱۶۔

۵۔ ایضاً۔

ماخذات

۱۔ آغا سہیل، ڈاکٹر، ادب اور عصری حسیت، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۱ء۔

۲۔ ابو الکلام قاسمی، مشرقی شعریات اور اردو تنقید کی روایت، مغربی پاکستان اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۰ء۔

۳۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، اردو مرکز، لاہور، ۱۹۶۷ء۔

۴۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، لاہور، ۱۹۸۳ء۔

۵۔ امتیاز احمد، اسلامی ناموں کا انسائیکلو پیڈیا، دارالاشاعتِ مصطفائی، دہلی، ۲۰۰۷ء۔

۶۔ اختر انصاری، غزل اور غزل کی تعلیم، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۹۸ء۔

۷۔ اسلوب احمد انصاری، ادب اور تنقید، سنگم پبلشرز، الہٰ آباد، ۱۹۶۸ء۔

۸۔ الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، کشمیر کتاب گھر، اردو بازار، لاہور۔

۹۔ انیس ناگی، تنقید شعر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۱ء۔

۱۰۔ انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، سوم، ۲۰۱۲ء

۱۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، اے۔ ایچ پبلشرز، لاہور، اپریل ۱۹۹۶ء۔

۱۲۔ ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر، اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر، ادبی پبلشرز، کراچی، ۲۹۷۶ء۔

۱۳۔ تنویر احمد علوی، ڈاکٹر، کلاسیکی اردو شاعری، مجلس ترقی ادب، لاہور، اگست ۲۰۰۹ء۔

۱۴۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، عزیز بک ڈپو، اردو بازار لاہور، دہم، ۲۰۱۴ء۔

۱۵۔ حفیظ صدیقی، ابو الاعجاز، مرتبہ، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، دوم، ستمبر ۱۹۸۵ء۔

۱۶۔ خاور اعجاز، نئی پاکستانی اردو غزل، ابلاغ پبلیشرز، لاہور، یکم جنوری ۲۰۰۱ء۔

۱۷۔ خالد محمود خان، فکشن کا اسلوب، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۱۴ء۔

۱۸۔ راجیسوراؤ اصغر، راجہ، ہندی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء۔

۱۹۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصنافِ ادب، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۱ء۔

۲۰۔ سنبل نگار، ڈاکٹر، اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، دارالنوادر، لاہور، ۲۰۱۳ء۔

۲۱۔ سعد اللہ کلیم، ڈاکٹر، اردو غزل کی تہذیبی و فکری بنیادیں، جلد اوّل، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء۔

۲۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، تنقیدی اصطلاحات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ ۲۰۱۱ء۔

۲۳۔ سرور الہدیٰ، ڈاکٹر، نئی اردو غزل، بیکن بکس، لاہور، ۲۰۱۵ء۔

۲۴۔ شاکر کنڈان، پروفیسر، تحمین زبان و ادب، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۳ء۔

۲۵۔ شاکر کنڈان، پروفیسر، سرگودھا کا دبستانِ شاعری، جلد دوم، اکادمیات: سمن آباد، لاہور، ۲۰۱۴ء۔

۲۶۔ شمیم حنفی، نئی شعری روایت، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۸ء۔

۲۷۔ شمیم حنفی، نئی غزل کا منظر نامہ، مکتبہ الفاظ مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ، ۱۹۸۱ء۔

۲۸۔ شان الحق حقی، مرتبہ، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، طبع اوّل، ۱۹۹۵ء۔

۲۹۔ طارق سعید، اسلوب اور اسلوبیات، نگارشات پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۸ء۔

۳۰۔ عاشر وکیل راؤ، مصاحبہ، سرگودھا، ا۔ جون ۲۰۱۸ء۔

۳۱۔ عاشر وکیل، ابھی امکان باقی ہے، شام کے بعد پبلی کیشنز، لاہور، فروری ۲۰۰ء۔

۳۲۔ عاشر وکیل راؤ، ترا ملنا ضروری ہے، قارِقلم پبلی کیشنز، لاہور، جنوری ۲۰۰۲ء۔

۳۳۔ عاشر وکیل راؤ،تم ہونا،دعا پبلی کیشنز،لاہور،،۲۰۰۷ء۔

۳۴۔ عبدالرشید نعمانی،مولانا،لغات القرآن،جلد چہارم،تالیف:مولاناسید عبدالدائم جلالی،دارالاشاعت کراچی،اپریل۲۰۰۷ء۔

۳۵۔ عبدالقدوس ہاشمی،تقویم تاریخی،ادارہ تحقیقاتِ اسلامی،اسلام آباد،دوم،۱۹۸۷ء۔

۳۶۔ عابدعلی عابد،انتقادِادبیات،سنگِ میل پبلشرز،لاہور،۱۹۶۶ء۔

۳۷۔ عبادت بریلوی،ڈاکٹر،غزل اورمطالعہ غزل،انجمن ترقی اردو،کراچی،۱۹۵۵ء۔

۳۸۔ عبدالقادرسروری،جدیداردوشاعری،کتب خانہ عزیزیہ،حیدرآباددکن،۱۹۳۹ء۔

۳۹۔ عابدعلی عابد،سید،اسلوب،مجلس ترقی ادب،لاہور،طبع دوم،جون ۱۹۹۶ء۔

۴۰۔ عتیق اللہ،پروفیسر،ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ،جلداول،اردومجلس،دہلی۔

۴۱۔ گوپی چندنارنگ،ادبی تنقیداوراسلوبیات،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،۱۹۸۴ء۔

۴۲۔ مزمّل حسین،ڈاکٹر،اُردُو میں علمِ بیان اور علمِ بدیع کے مَباحث،مجلس ترقی ادب،لاہور، جولائی،۲۰۱۰ء۔

۴۳۔ محمدرؤف،اردوغزل مابعدنوآبادیاتی مطالعہ،روہی بکس فیصل آباد،جون 2015ء۔

۴۴۔ منظورحسین،خواجہ،اردوغزل کاخارجی روپ بہروپ،مکتبہ کارواں،لاہور،۱۹۸۱ء۔

۴۵۔ محمد عبد الرحمان کمیانہ، پیار،محبت اور عشق،دریائے محبت، فیروز سنز،لاہور،بارِ اوّل، ۲۰۰۹ء۔

۴۶۔ محمداجمل سروش،اردوغزل میں عروضی تجربات،راہی بکس فیصل آباد،۲۰۱۶ء۔

۴۷۔ نورالحسن ہاشمی،دلی کادبستانِ شاعری،اردواکیڈمی سندھ،کراچی،۱۹۶۶ء۔

۴۸۔ نیازفتح پوری،انتقادیات،ادارہ ادب العالیہ،کراچی،۱۹۵۹ء۔

۴۹۔ نجم الغنی،مولوی،بحرالفصاحت،مجلس ترقی ادب،لاہور۔

۵۰۔ وزیرآغا،ڈاکٹر،اردوشاعری کامزاج،مجلس ترقی ادب،لاہور،مئی ۲۰۰۸ء۔

رسائل وجرائد

۱۔ عاشر وکیل راؤ، سہ ماہی 'وصال'، سرگودھا، شمارہ نمبر ۱، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۷ء۔

۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ماہنامہ 'اوراق'، لاہور، جلد: ۱۵، شمارہ: ۹، ستمبر، اکتوبر، ۱۹۸۰ء۔

انٹرویوز

۱۔ ارشد محمود ارشد، سرگودھا۔

۲۔ ارشد ملک، پروفیسر، سرگودھا۔

۳۔ ذوالفقار احسن، سرگودھا۔

۴۔ شاکر کنڈان، پروفیسر، سرگودھا۔

۵۔ شفیق آصف، پروفیسر، ڈاکٹر، سرگودھا۔

۶۔ عاشر وکیل راؤ، سرگودھا۔

۷۔ مرتضیٰ حسن، پروفیسر، سرگودھا۔

Web Site

1. http://nlpd.gov.pk/uakhbareurdu/october2012/oct_7.html۔
2. http://www.urdulinks.com/urj/?p=1964۔
3. https://ur.wikipedia.org/wiki/۔